سفر ٹورنٹو کینیڈا کا
کائنات بشیر
PDFBOOKSFREE.PK

سفر ٹورنٹو کینیڈا کا

(سفر نامہ)

کائنات بشیر

انتساب!

اپنے اس شوق کے نام،
جو مجھے لوگوں، ملکوں اور فطرت
کے درمیاں کشاں لے جاتا ہے۔

پیش لفظ

سفر کرنا، دنیا کی خاک چھاننا، دنیا والوں کی تلاش میں نکلنا اور ان کے کام کاج سے آ گاہی حاصل کرنا کچھ زندہ دل لوگوں کا من پسند پروگرام ہوتا ہے۔ جو اپنے بستر، تکیے کو چھوڑ کر نہ صرف خود کا ظرف آزماتے ہیں بلکہ نئی جگہوں، نئے لوگوں، منفرد ثقافت اور کہیں نہ کہیں فطرت سے جا جڑتے ہیں۔ کسی ایڈونچر، خوبصورتی کی آڑ میں خوب سے خوب تر پانے کی جستجو انھیں متحرک رکھتی ہے۔ پھر وہ اپنے دن اور رات تیاگ کر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ سو کہیں نہ کہیں میں بھی انھی لوگوں کا حصہ ہوں۔ میں بھی کئی ملکوں جا چکی ہوں اور اللہ کی مہربانی، میرا تخیل بھی اتنا حساس ہے کہ سفرناموں کے ذریعے بھی میں وہ سب کچھ تصور اور محسوس کر پاتی ہوں۔ جہاں مصنف کا قلم پہنچا دیتا ہے۔ سفرنامہ کے حوالے سے مستنصر حسین تارڑ ایک آئیڈیل مصنف ہیں۔ جن کا سفرنامہ سنولیک ادب کی اس صنف میں میری توجہ کا باعث بنا تھا۔ پھر امریکی یاترا، براہ راست، سات ستارے صحرا میں، جیسے سفرنامے میری مزید دلچسپی کا باعث بنے۔
بذات خود میں نثر میں لکھتی ہوں اور شاعری کرنا میری ذات کی تسکین ہے۔ میری نثری ای بک۔۔ چاند اور صحرا۔ ایک اردو سائیٹ پر لانچ ہو چکی ہے۔ شاعری کی ای بک بھی تیار ہے۔ اب انتظار ہے تو ایک اچھے سے پبلشر سے رابطے میں آنے اور تال میل بننے کا، پھر انشاءاللہ وہ دونوں کتابیں بھی آپ کے سامنے کتابی شکل میں موجود ہوں گی۔۔

میں کینیڈا دو دفعہ جا چکی ہوں۔ دوسرا ٹور ابھی حال ہی میں ہوا ہے۔ بس کچھ مہربانوں کی فرمائش پر اس بارے لکھا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ سفر اتنا زیادہ پسند کیا جائے گا۔ یہ ہے تو اک ذاتی سفر کی روئیداد، لیکن پڑھنے والے کرم فرماؤں نے اسے سفرنامہ کا اعزاز بخش دیا تو مجھے اس پر از سر نو نظر ڈالنا

پڑی۔ میں نے اپنی دونوں ای بک پر قارئین کے لیے ایک جملہ لکھا تھا سوئے اتفاق کہ اب سہ بارہ بھی لکھ رہی ہوں کہ۔۔ادب کی اس صنف میں یہ میری پہلی کاوش ہے۔۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میری لکھی تیسری کتاب آپ کے سامنے میرا پہلا تعارف بن کر آرہی ہے۔۔

دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔اور اپنے رسپانس اور آراء سے ضرور نوازیئے گا۔شکریہ

کائنات بشیر

جرمنی

kainat-bashir@hotmail.com

ترتیب

16۔شوق اور شائقین، ہم ٹی وی ،ڈرامے اور ڈرامہ ہم سفر،

17۔تاریخی نظر، کینیڈا رقبے کے لحاظ سے دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے۔

18۔اونٹاریو سائنس سنٹر، سو سالہ جشن آزادی پر حکومت کی طرف سے عوام کیلئے خاص الخاص تحفہ،

19۔بلفر پارک، قدرت کے نظاروں میں ایک اور مقام بلفر پارک ہے۔

20۔سی این ٹاور، ٹورنٹو کی ایک بڑی پہچان سی این ٹاور کی صورت ہے۔

21۔ٹورنٹو کے کھانے، دوسرے ملک جا کر وہاں کے کھانے اور کھلانے والے دونوں اچھے لگتے ہیں۔

22۔حویلی، بیک وقت خوبصورت ریسٹورنٹ ،بینکوئٹ ہال اور اس کا عمدہ بوفے سسٹم،

23۔دہلی دربار، دوست احباب کی طرف سے دیا گیا یادگار دعوتی ڈنر دہلی دربار میں کھایا گیا۔

24۔اپما اور ہم، ایک ہائی بلڈنگ، چوبیسویں منزل، خوبصورت لوکیشن اور اپما۔۔،

25۔فلم ،میلہ اور اگست، ٹورنٹو میں اگست ہنگامے سے بھرپور مہینہ، ایشئین فنکار اور کنسرٹ،

26۔اپنے اپنے خول، ملٹی نیشنل قومیں، کام اور لوگ، اپنے اپنے کھانے اور اپنی اپنی کمیونیٹی ،

27۔چینی بازار، چینی لوگ، چائنی ریسٹورنٹ اور ایک چھما تا پلازا۔

28۔جیرالڈ سٹریٹ اور شاپنگ ، پاکستانی اور انڈین لوگوں کا اپنا بازار، اپنے لوگ، کلچر اور رش۔

29۔اقبال فوڈ، ٹورنٹو کا سب سے مشہور پاکستانی گروسری سٹور، جہاں اپنی چیزیں اپنے لوگ۔

30۔مہنگائی اور لوگ، ہر ملک کی طرح کینیڈا میں بھی مہنگائی ،ڈالر کرنسی ،ٹیکس اور کھانے پینے کی اشیاء،

31۔بس اور ٹرین، ایک مقامی ٹرین کی چھک چھک چھکا چھک نے پاکستان کی یاد دلادی۔

32۔دل کے ارماں، اے زہرہ جبیں، آج کیا پکا ہے؟

33۔لائف سٹائل، لوگ سوشل، ملنسار ہیں اور آئے دن وہاں گیدر نگ ہوتی ہے۔

34۔انٹاریو، کینیڈا کی جھیلوں میں سے ایک جھیل کے نام پر انٹاریو صوبے کا نام رکھا گیا ہے۔

35۔انداز اپنا اپنا، یہاں لوگ کیک لیجانے کو پھولوں پر ترجیح دیتے ہیں۔

36۔ادب اور ادبی لوگ، یہاں لائبریری تو بہت ہیں اور کتابوں کی بھی اچھی خاصی کولیکشن موجود ہے۔

37۔واک، دنیا کا ہنگامہ سامنے برپا ہوتا لیکن فطرت اور نظارے اپنی اور کھینچتے۔

38۔رنگولی، فلموں، ڈراموں والی رنگولی ایک گھر کے باہر بنی تھی۔

39۔چینی یا جاپانی، ایک روز واک کرتے ایک عورت ملی جسے ہم جاپانی سمجھ بیٹھے۔

40۔ریت رواج، دنیا میں کہیں بھی چلے جاؤ، لیکن ان ریت رواج سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔

41۔ایک خاص تحفہ، جس نے ہمارے سفر کو کیا سے کیا بنا دیا۔

42۔لاہور یاد آنے لگا، کینیڈا میں نہ جانے کیوں ہمیں لاہور یاد آتا رہا۔

43۔گھر کی دعوت، رشتے دار ہوں یا دوست احباب دعوت میں سب اکٹھے مل بیٹھتے ہیں۔

44۔پہچان، پہچان کے حوالے سے اک نیا مرحلہ سامنے آ کھڑا ہوا۔ آپ کہاں سے ہیں؟

45۔خدانخواستہ، اللہ، اپنی امان میں رکھنا، اس بار ہیلتھ انشورنس کے بغیر کینیڈا چلے گئے۔

46۔کرسمس اور نیا سال، گوروں کی کرسمس اور نیا سال اس بار ہم کینیڈا میں دیکھنے والے تھے۔

47۔فائر الارم اسٹیشن، اکثر فائر الارم بجاتی گاڑی تیزی سے ہمارا دل دہلا کر گزرتی۔

48۔آبشار، ہمارا دل آبشار دیکھنے کے لیے اتاولا ہو رہا تھا۔

49۔ نیا گرا، نیا گرا دراصل ایک شہر کا نام ہے جسکے نام پر آبشار کا نام رکھا گیا ہے۔

50۔ نیا گرا فال، سی این ٹاور اور نیا گرا فال کینیڈا کی پہچان ہیں۔

51۔ قرب و جوار، مسی ساگا، برلنگٹن، اوسلو، کیمرج، نیا گرا، یہ سب ٹورنٹو کے گردونواح کے شہر ہیں۔

52۔ فوٹو شوٹ، کینیڈا میں فطرت کے نظارے ہم بار بار کیمرے میں مقید کرتے رہے۔

53۔ سردی اور گرم کپڑے، سنی سنائی سردی سے گھبرا کر ہم بہت سے گرم کپڑے لے آئے تھے۔

54۔ اچھی میزبانی، ہمارے طفیل میزبان کو دعوت کھانے کی عادت پڑ گئی۔

55۔ واپسی کی پیکنگ، چل اکیلا چل اکیلا، چل اکیلا، تیرا میلہ پیچھے چھوٹا راہی چل اکیلا،

56۔ خوش رہو اہل کینیڈا، خوش رہو اہل چمن ہم تو چمن چھوڑ چلے۔۔

57۔ پھر ملیں گے، قسمت نے گر ملا دیا۔۔۔۔۔

58۔ ائر پورٹ بک شاپ، انگلش ناول، ڈچ میگزین اور ادبی مسافر۔۔

59۔ آشیاں اپنا، ایک نظر میں گھر اجنبی کی طرح نظر آیا۔

60۔ اگلے سفر کا انتظار، مسافر، انتظار، پڑاؤ اور اگلی منزل۔۔

نادیدہ جہانوں کے دکھائے مجھے رستے

پھر میری اڑانوں کو تمنائے سفر دی

سفر کی لکیر

سفر کرنا سیاحت کرنا ایک خوشگوار مشغلہ ہے۔ کچھ لوگوں کے لیے سفر کرنا اک وبال ہے۔ اچھی بھلی چلتی روٹین کی زندگی میں ایک دم اٹھ کر سکول بیگ کی طرح سوٹ کیس پیک کرنا اور مسافر کی مانند چل دینا کہ نہ دن اپنا نہ رات اپنی ،اسی لیے وہ اخبار میں ہفتہ وار کالم ۔۔ستارے کیا کہتے ہیں۔۔ بھی نہیں دیکھتے کہ کہیں اچانک سفر کی روانگی کا اشارہ نہ مل جائے۔۔

کمال حیرت اس کے برعکس بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنی زندگی بھر پور انداز سے گزارنا چاہتے ہیں۔نئی نئی جگہ جانا چاہتے ہیں۔اپنی بور لائف میں کچھ جان ڈالنا چاہتے ہیں اور زندگی کی دوڑ میں حصہ لینے کے لیے تازہ دم ہونا ضروری سمجھتے ہیں۔سفر دراصل زندہ دل لوگوں کی تفریح ہے اور یہ سیاحت اس وقت کچھ اور بھی پر کشش ہو جاتی ہے، جب یہ خود پلان کی جائے۔اپنی مرضی سے کسی پر فضا مقام،شہر اور ملک جایا جائے۔نئی دنیا کھوجی جائے۔کائنات کی وسعت جانچی جائے۔ نئے نئے لوگوں سے ملا جائے اور وہاں کے خوبصورت دلفریب نظارے آگے بڑھ کر مسافر کا دامن تھام لیں تو دل کتنا پرسکون ہو جاتا ہے اور یقیناً ان لمحوں کا کوئی مول نہیں۔۔

ذات آگہی ہوئی تو معلوم پڑا کہ میرے اندر بھی ایک ٹورسٹ چھپا ہوا ہے۔ مجھے فطرت اور خوبصورت مقامات بہت متاثر کرتے تھے۔ایک بار پاکستان سے واپسی پر ائر پورٹ کی بک شاپ سے میں نے کچھ من پسند کتابوں کو خریدتے ہوئے مستنصر حسین تارڑ کا سفرنامہ سنولیک بھی خرید لیا تھا۔اور اپنی بکس ریک کی زینت بنا لیا تھا۔تقریبا ایک سال وہ وہاں پڑا رہا اور جب کچھ اور خاطر خواہ مواد پڑھنے کو نہ ملا تو ایک دن میں نے اسے اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا۔وہ سفرنامہ میرے لیے اتنی دلچسپی کا

باعث بنا کہ پھر میں نے اور سفر نامے بھی پڑھنا شروع کر دیئے۔ امریکی یاترا، چلتے ہو تو چین کو چلئے، براہ راست اور سات ستارے صحرا میں، کمال کے سفر نامے ہیں۔ اور اب تک میں مستنصر حسین تارڑ کے تو تمام سفر نامے پڑھ چکی ہوں اور تخیل کے ذریعے ان تمام شمالی علاقہ جات کی خوبصورتی، دلکشی اور اک سحر محسوس کر چکی ہوں۔۔

بذات خود میں اب تک پاکستان اور جرمنی کے علاوہ سعودی عرب، انگلینڈ، ہالینڈ، ڈنمارک، بلجیئم، شام اور کینیڈا جا چکی ہوں۔ سوئٹزرلینڈ، پیرس، ترکی، ایران اور دبئی جانے کی خواہش ابھی دل میں کروٹیں لیتی ہے۔۔

دو ہزار سات میں پہلے بھی کینیڈا کی جانب سفر کیا جا چکا ہے۔ کہ ایک دم پھر ہمارے ہاتھ میں سفر کی لکیر نمودار ہوئی کہ اب پھر وہاں مقیم عزیزوں اور رشتہ داروں کو یکدم ہماری یاد بری طرح ستانے لگی تھی۔ ورنہ ابھی تو چار سال پہلے ہی وہاں حویلی اور دہلی دربار میں کھائی دعوت کا مزا باقی تھی۔ وہاں کی گئی سیریں، ملنا ملانا، شاپنگ، سینما میں دیکھی فلم سب یاد ہی تو تھا۔ لیکن ان گلیوں کی رونق، مہکتی فضاؤں اور حسین نظاروں کو دوبارہ دیکھنے اور محسوس کرنے کے لیے وہاں دوسرا قدم دھرنا ضروری تھا۔

زادراہ

ستاروں کی چال کے آگے ہم بے بس تھے۔سو تیاری پکڑ لی۔پچھلی بار سفر گرمی میں کیا تھا اور اس بار کینیڈا کی مشہور سردی اور برفباری کا سامنا ہونے والا تھا۔جس کے لیے وہاں سے بھی بار بار شدید سردی کے ہونے بارے بتایا جارہا تھا اور جرمنی والے دوست احباب بھی کینیڈا کی شدید برفباری کا نقشہ ہماری آنکھوں کے آگے کھینچ رہے تھے۔اور اپنے اپنے تجربات سے آگاہ کر رہے تھے۔اور مطلوبہ پیکنگ سے بھی زیادہ کپڑے ساتھ لے جانے پر اصرار کر رہے تھے۔سو مہربانوں کی مہربانی کی بدولت ایک پیک زیادہ تیار ہو رہا تھا۔فر والے کوٹ،اونی ٹوپیاں،اونی شال،گرم دستانے،بے شمار جرسیاں،گرم لباس، گھٹنوں تک لانگ شوز،لگ رہا تھا جیسے وہاں جا کر اسکیمو دور واپس ملنے والا ہے۔اور ساتھ ساتھ رحم بھی آ رہا تھا کینیڈا کے باسیوں پر،جو ہر سال اتنی شدید سردی و برفباری سے گزرتے ہیں۔برفباری اور سرد موسم تو ہم یورپ میں رہنے والے بھی ہر سال دیکھتے ہیں لیکن پھر بھی یہاں کی اتنی دھوم نہیں مچتی کہ بندہ خوفزدہ ہو کر رہ جائے۔اگلی سردی کے سیزن سے پہلے ہی سہما سہما پھرے اور دوسروں کو بھی ڈراتا پھرے۔خیر اب تو جو بھی تھا اس کا نظارا اس سال ہونے والا تھا۔دل کو مضبوط کیا کہ آخر مستنصر حسین تارڑ بھی تو ہے اور اس کی ساتھی پارٹی میاں فرزند، ندیم، بقا، زاہد، سلمان، عامر،شاہد،جو شمالی علاقہ جات میں جا کر اتنی سردی میں پہاڑوں پر کر اس کا سامنا کر کے آتے ہیں اور ہنستے ہیں کھیلتے ہیں، انجوائے کرتے ہیں۔کوفتے کے ٹن کھول کر گرم کرتے ہیں اور دیسی گھی کے پراٹھے اور انڈے کھاتے ہیں۔ویسے میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ وہ وہاں کبھی بھی چاول کیوں نہیں کھاتے؟پھر خیموں میں سردی سے سکڑتے ہوئے رات گزارتے ہیں اور اگلے سال پھر اک ان دیکھی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔

اور ادھر تو صرف کینیڈا کی سردی ہی دیکھنی تھی۔ کونسا کوئی وہاں کے پہاڑوں پر چڑھنا تھا یا ان کے درمیان رات گزارنا تھی۔ بلکہ اچھی بات ہے آئندہ کے لیے ہم بھی وہاں کی سردی کا یورپ کی سردی سے موازنہ کرسکیں گے۔ اور قصہ گو کی طرح اوروں کو بھی سنا سکیں گے۔۔

سو ٹکٹ بھی آ گئے۔ میری ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ ٹکٹ ہاتھ میں آتے ہی سفری حساب کتاب کرنے لگتی ہوں۔ لاشعور میں کہیں یہ بات ہوتی ہے کہ یا اللہ، سفر میں جانے اور واپس آنے کا وقت معقول ہو۔ بس رات کہیں ادھر ادھر ہو جائے۔ اور بندہ دن، دن میں ہی جا کر میزبان کو اپنی شکل دکھا دے۔ اور میزبان بھی فریش موڈ میں خوش آمدید کہہ سکے۔ ورنہ رات کی تاریکی میں تو مہمان اور میزبان دونوں بوکھلائے بوکھلائے سے ملتے ہیں۔ اور نیند، تھکاوٹ سے بند ہوتی آنکھوں کو کھول کر اک رواداری کی مسکراہٹ سجا کر ظاہر داری نبھا رہے ہوتے ہیں۔

ٹکٹ دیکھا تو صبح چھ بجے کی فلائٹ تھی۔ دیکھنے سننے والوں کے حساب سے بھی معقول وقت تھا۔ میں حساب کتاب میں مگن ہو گئی۔ چھ بجے فلائیٹ تو چار بجے ائرپورٹ حاضری دینا ہو گی۔ ایک گھنٹہ وہاں تک جانے کے لیے درکار ہو گا۔ تو اس رات کتنے بجے سویا جائے اور بستر کو ہاتھ لگا کر اٹھا جائے۔ دیکھا تو تین، ساڑھے تین گھنٹے سونے کے لیے مل رہے تھے۔ جس میں نیند کو لانے کی کوشش اور پھر اٹھنے کی زبردستی بھی شامل تھی۔ کہ اس وقت اٹھ کر قدم کہیں رکھنے تھے اور پڑنے کہیں تھے۔ کچھ سوچ کر سونے کا پروگرام ہی کینسل کر دیا۔ جل پان کی البتہ اس وقت کوئی فکر نہ تھی۔ آخر ائیر فرانس کے مہمان بننے والے تھے اور فرانسیسی حسینائیں کھانے کے خوان لیے ہمارے آگے پیچھے پھرنے والی تھیں۔ کچھ دل میں یہ بھی خوش فہمی تھی کہ کیا پتا جہاز والے ہی اس ظالم دنیا سے دور آسماں کی بلندیوں پہ لے جا کر سرسراتی ہواؤں اور اڑتے بادلوں کے سنگ کوئی لوری ہی سنا دیں،

آ چل کے تجھے میں لے کے چلوں اک ایسے گگن کے تلے

جہاں غم بھی نہ ہو آنسو بھی نہ ہو بس پیار ہی پیار پلے

ستم یہ ہونے جا رہا تھا کہ جس رات کے گل ہونے کی فکر سفر کے بعد میں ستا رہی تھی ۔وہ سفر سے پہلے گل ہو رہی تھی ۔اور دن دو گنا لمبا ہونے جا رہا تھا۔اس کی پھر بھی اتنی فکر نہ تھی ۔میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جب لوگ دوسرے ملک سفر کرتے ہیں تو تھکے ہارے فوراً جا کر بستر پکڑ لیتے ہیں ۔اس طرح انھیں اس ملک میں سیٹ ہوتے ہوتے کئی دن لگ جاتے ہیں ۔اور میں نے سفر چاہے کینیڈا کی طرف کیا ہو یا پاکستان کی جانب ،اپنی تھکاوٹ ،نیند کو ایک طرف رکھ کر ہمیشہ وہاں کی رات ،وقت کے حساب سے نیند لی ۔اس طرح پہلے روز سے ہی بندہ وہاں کے اوقات کار میں سیٹ ہو جاتا ہے ۔۔

خیر وہ سفری دن بھی آ گیا۔اللہ کا نام لے کر سفر شروع کیا۔ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ائر پورٹ پر پہنچ گئے۔پاکستان ہوتا تو اتنی صبح ابھی خاکروب بھی اپنا کام شروع نہ کر پاتے اور یوگا کرنے والے بھی ابھی نیند کے مزے لے رہے ہوتے ۔اور ادھر گویا باہر ابھی رات کا جادو چل رہا تھا لیکن ائیر پورٹ پر زندگی ہمیشہ جواں ہی ملتی ہے ۔اک افراتفری ،اک جلدی مچی ہوتی ہے ۔لوگ ،ڈھیروں سامان ،لمبی قطاریں اور اک حالت سفر ۔۔

ہمیشہ کی طرح جرمن لوگ کم اور دوسرے لوگ زیادہ نظر آ رہے تھے ۔گو جرمن فیملی موجود تھیں مگر کم سامان اور کم بچوں کے ساتھ ، جرمن ایک مغرور قوم تو ہے ہی مگر باتیں بھی کم کرتی ہے اور وہ بھی ۔۔۔سرگوشی کے عالم میں ،اسی لیے سپین کے لوگ رونق والے مانے گئے ہیں ۔جو اونچی آواز میں بولتے ہیں ،

باتیں کرتے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں اور اک شور بپا کرنے میں ماہر ہیں۔اسی لیے یورپی اقوام میں انھیں زندہ دل قوم مانا گیا ہے۔اور موسم گرما کی تعطیلات ہوں یا پھر ویسے چھٹیاں منانی ہوں لوگ سپین کے گرم موسم کو ترجیح دیتے ہیں تو یقیناً کہیں نہ کہیں رویوں کا دخل بھی ہوتا ہوگا۔ویسے چھٹیاں منانے کے لیے تو یورپ کے لوگ ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔چھٹیوں کے ذکر پر ان کے لہجے میں اک انوکھی سی خوشی آ جاتی ہے ۔اور اپنے یہ چار دن کے کھائے اڑائے پہ انھیں ذرا بھی پچھتاوا نہیں ہوتا۔غالباً وہ یہی سوچتے ہوں گے کہ جان ہے تو جہان ہے اور یہ دولت ساتھ تھوڑی لے جانا ہے۔کتنے چالاک،ہوشیار ہیں کہ ہمارے اقوال زریں ان کے کام آ رہے ہیں۔ویسے یہ بات تو قابل قبول ہے کہ یہ اپنا کام ایمانداری سے کرتے ہیں تو اس کے بعد چھٹیوں کے حقدار واقعی بن جاتے ہیں۔

شی پول ائیر پورٹ

جرمنی سے فلائٹ مقررہ وقت پر چلی اور پہلے پڑاؤ تک سفر ایک گھنٹے میں طے ہوا۔اب ہالینڈ کے مشہور شہر ایمسٹرڈم کے انٹرنیشنل شی پول ائر پورٹ پر جہاز اتر چکا تھا۔پاکستان،انگلینڈ یا کینیڈا جاتے ہوئے ہمیشہ یہ ائرپورٹ بیچ چوراہے کی طرح راستے میں آجاتا ہے۔اور میرے خیال سے یہ حد سے زیادہ بڑا بھی ہے۔اگر اس کے اے لاؤنج سے پیدل چلو تو ایچ لاؤنج تک پہنچتے پہنچتے پون گھنٹہ لگ جاتا ہے۔اسی لیے لوگ یہاں متبادل طریقے زیادہ اپناتے ہیں۔گویا انھیں بھی اس مسافت کا بخوبی اندازہ ہے۔۔

ہر ملک کا ائرپورٹ بھی کسی نہ کسی طور اپنی ثقافت کو نمایاں کر رہا ہوتا ہے۔اسی لیے پہلی بار آئے مسافر کو جہاز سے نکل کر ائرپورٹ پر پہلا قدم رکھتے ہی وہاں کا ماحول اپنی طرف کھینچنے لگتا ہے۔وہاں کی مٹی، وہاں کے باسی اپنی پہچان آپ کرانے لگتے ہیں۔سو یہاں آتے ہی ڈھیروں پن چکیاں،بہت سی گائے اور پھولوں کے کھیت میرے تخیل پر ابھرنے لگےاور ہندی فلموں کے گیت یاد آنے لگے۔جو ہالینڈ کے خوبصورت پھولوں کے درمیاں فلمائے گئے تھے۔پھول تو کہیں بھی ہوں انسانی توجہ اپنی طرف مرکوز کر لیتے ہیں۔کسی پھولوں کی نرسری ہی چلے جاؤ تو طبیعت شاد ہونے لگتی ہے۔اور یورپ میں تو پھولوں سے گوروں کی محبت میں نے خود دیکھی ہےاور اس محبت پر انھیں بہت سی رقم خرچ کرتے بھی دیکھا ہے۔

ایک بار ایک جرمن عورت نے کہا تھا کہ،

"جو شخص پھولوں سے پیار نہیں کرتا وہ انسانوں سے بھی محبت نہیں کر سکتا۔"

واہ،کیا اقوال زریں جیسی بات کہی گئی۔

فلم پریم روگ اور سلسلہ فلم ہی وہ ابتدائی فلمیں تھیں،جن میں اتنی پھولوں کی بہار نظر آئی۔میری ایک

رشی کپور اور پدمنی کولہاپوری کی کاسٹ میں یہ فلم بنی تھی۔ اچھی فلم تھی۔

بھنورے نے کھلایا پھول، پھول کو لے گیا راج کنور

بھنورے تو کہنا نہ بھول، پھول تجھے لگ جائے میری عمر

ایک بہت خوبصورت گیت تھا اور پھولوں کی خوبصورتی اتنی نمایاں ہو رہی تھی کہ ہیرو، ہیروئین کو سفید لباس پہننے پڑے تھے۔

اسی طرح امیتابچن اور ریکھا کی پریم کہانی کے دوراں فلم سلسلہ کے گیت بھی انھی پھولوں کے درمیاں فلمائے گئے تھے۔

دیکھا ایک خواب تو یہ سلسلے ہوئے

دور تک نگاہ میں ہیں گل کھلے ہوئے

شی پول ائرپورٹ پر مجھے کافی نئی تبدیلیاں نظر آ رہی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا کہ ایک فوٹو شوٹ ہو جائے۔ لیکن دل کو سمجھانا پڑا کہ ابھی تو آغاز سفر ہے، اس لیے اتنا اتاولا ہونے کی ضرورت نہیں چپ چاپ بیٹھا رہ۔ لیکن چونکہ ہالینڈ پہنچ چکے تھے۔ اور یہ گمان بھی تھا کہ ہم بھی جرمنی میں جو دودھ پیتے ہیں، اور اس سے بنے کھیر، گجریلے، حلوے مانڈے کھاتے ہیں۔ ہو نہ ہو وہ دودھ بھی ہالنیڈ کے کسی فارم ہاؤس کے کھیت میں گھاس چرتی، شو مارتی، ماڈلنگ کرتی گائے کا ہی ہے۔ تو چونکہ بنفس نفیس تشریف لے آئے تھے، تو اس کا بھی دل میں شکر یہ ادا کرنا ضروری سمجھا۔ بھئی آخر اتنا تو بندے کو کرنا چاہیے نا۔

ابھی یہاں صبح کے نو بجے تھے۔ یورپ میں ہو کر ابھی یورپ ہی کی خاک چھانی جا رہی تھی۔ اگلے میزبانوں نے ایک گھنٹہ پہلے حاضری کا حکم دیا تھا۔ بورڈنگ جرمنی سے ہی ہو چکی تھی۔ سامان بھی

سیدھا ٹورنٹو تک بک ہو چکا تھا۔اس لیے اب نہ کوئی فکر تھی نہ ٹینشن ،ورنہ دو پروازوں کے درمیان وقت کم ہوتو وہ افراتفری ،جلدی مچتی ہے اور ساتھ ساتھ وہم خدشات بھی ستاتے ہیں کہ یہ ہم سے بہتر کون جان سکتا ہے کیونکہ اسی سلسلے ایک تجربہ ہو چکا ہے۔۔۔

ایک بار انگلینڈ جانا تھا۔جرمنی کے شہر سے پہلی فلائٹ ہی لیٹ چلی اور فرینکفرٹ بھی لیٹ پہنچی ۔تو بھاگ بھاگ کر جا کر اگلی فلائیٹ لی۔دل میں بڑا خوش ہوئے کہ بس کی طرح جہاز بھی بھاگ کر لے لیا۔وہ تو مانچسٹر جا کر پتہ چلا کہ ہمارا زادراہ ہمارے ساتھ نہیں پہنچا۔اور ہم ہینڈ کیری کے ساتھ آخری مسافر بنے کھڑے تھے۔سامان گم ہو جانے کا خدشہ، بلکہ دل میں کھو جانے کا افسوس بھی یقیناً ہمارے چہرے پر جھلک دے رہا ہوگا۔اور اس وقت میزبان ہمارے درد کا درماں بن رہے تھے۔جو کچھ ان الفاظ میں ہمیں تسلی دے رہے تھے کہ،

:فکر نہ کریں سامان مل جائے گا۔یہ پاکستان نہیں ہے کہ سامان گم ہو جائے اور واپس ہی نہ ملے۔چلیے گھر چلتے ہیں۔:

یہ بات سن کر دل چاہ رہا تھا کہ سامان ملنے پر میزبان کا منہ لڈؤں سے بھر دیں۔لیکن پھر ایسی کوئی بھی منت مانگنے سے گریز کیا۔کیونکہ پہلے ہی ایک خسارا سامنے تھا۔بس چند لمحے کو اپنی آنکھیں بند کر کے اپنا ایمان پختہ کیا کہ اگر قسمت میں ہوگا تو سامان مل جائے گا۔ورنہ جس کی قسمت میں ہے پھر وہی یہ سامان رکھے اور ہمارے کپڑے پہن کر مٹکتی پھرے۔ویسے سامان میں ہمارے کپڑوں سے زیادہ میزبان فیملی اور ان کے بچوں کے لیے تحفے تحائف تھے۔اصل خسارا تو ان کو ہونے والا تھا۔جن کے ستارے نادانستگی میں ہم سے آکر ٹکرا گئے تھے۔نہ جانے کسے دیکھ کر ان کا آج کا دن شروع ہوا تھا۔۔۔

ورنہ ہم تو معصوم تھے، مسافر تھے اور اب لٹے پٹے مسافر بھی بن چکے تھے۔۔۔

انفارمیشن اور شکایات درج کرانے کے کاؤنٹر سے ہمیں بتایا جا چکا تھا اور تسلی دی جا چکی تھی کہ ہمارا سامان کل آ جائے گا۔ اس بات پر ہم بے یقینی سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ چکے تھے۔ اور انکے الفاظ بار بار ہمارے کانوں میں شور مچا رہے تھے۔ دل چاہ رہا تھا کہ ائرپورٹ پر ہی رات گزار لیں اور کل سامان ملنے کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ آخر زندگی میں پہلی بار کوئی گمشدہ چیز واپس ملنے والی تھی۔ لیکن اس خواہش ناتمام کو پرے کر کے گھر جانا پڑا۔ اور اگلی صبح کے سورج کے ساتھ ہی سوری میم، سوری میم کہتا ہوا ائرپورٹ کا عملہ سامان میزبان کے گھر چھوڑ کر جا چکا تھا۔ سامان دیکھ کر دل ناتواں کو تراوٹ پہنچی۔ اور میزبان خوش ہو کر کہہ رہے تھے کہ،

: دیکھا ہم نہ کہتے تھے۔ کہ سامان کو کچھ نہ ہوگا، وہ صحیح سلامت مل جائے گا، پر یہ گارانٹی صرف انگلینڈ کے اندر کی ہے باہر کا پتہ نہیں۔:

ساتھ اور لوگوں کی داستاں سنا رہے تھے کہ فلاں فیملی یہاں سے پاکستان گئی۔ وہ خود تو پاکستان پہنچ گئے پر نہ جانے کیسے اس کا سامان کینیا پہنچ گیا۔ اور پاکستان میں ان کا دو ماہ کا وقت پریشانی، ٹینشن اور سامان کی تفتیش میں ہی گزرا۔ اور جب وہ تھک ہار کر واپس انگلینڈ پہنچ گئے تو سامان بھی نہ جانے کہاں کہاں سے گھوم پھر کر واپس انگلینڈ پہنچ گیا لیکن ٹوٹی پھوٹی حالت میں۔ ہاں بھئی یہ دنیا ہے یہاں کچھ بھی ممکن ہے۔ بہر حال ہم تو اپنی داستان اب تک بہتوں کو سنا چکے ہیں۔ البتہ یہ کہانی ان کے لیے داستان حسرت بن جاتی ہے، جن کا سامان تو گم ہوا اور آج تک نہیں ملا۔ لیکن اس کے بعد اب، ہم احتیاط اور بھی لازم سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ بغیر سامان کے میزبان کے روبرو ہونا کیسا لگتا ہے۔۔

سو کبھی وقت ٹھہرا ہے نہ مسافر،

ایک گھنٹہ پہلے بی لاؤنج سے چلتے چلتے ایف سی ویٹنگ لاؤنج پہنچ گئے۔ارے واہ،ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں سماں رنگین ہو چکا تھا۔اس وقت کوئی بھی لاؤنج اتنا فل نہیں تھا جتنا یہ بھرا ہوا تھا۔کہ لوگ سیٹیں بھری ہونے کے باعث کھڑے تھے۔ملٹی نیشنل لوگوں کو دیکھتے ہی پتہ چل گیا کہ صحیح مقام پر پہنچ چکے ہیں۔رنگ برنگے پھول تو دیکھے تھے۔اب رنگ رنگ کے لوگ بھی نظر آنے لگے۔اوران ملٹی اقوام لوگوں کوایک پلیٹ فارم پردیکھ کرمن مہکنے لگا۔سوچا اس کارواں کے ساتھ سفر کرنے میں مزا آئے گا۔جو آگے بڑھنے کوتیار نظر آرہا تھا۔ایسے ہمراہی ساتھیوں کے ساتھ سفر کا خیال ہی کتنا خوش کن تھا۔یہ سفر دن کے اجالے میں طے ہونے والا تھا۔اگر رات ہوتی تو بھی بوریت نہ ہوتی۔اس خیال پر جب اپنے دل کی جانب نگاہ کی تو وہ کچھ یوں کہہ رہا تھا،

چلو چلیں دل لے چلے جہاں اجی دور

بڑی دور جہاں ملے زمیں سے آسماں

ائرفرانس

دنیا میں جب بھی کسی جانب سفر کیا جاتا ہے تو جانے کے لیے وہ ملک ،شہر اس کے باسی اور رشتے دار تو سفر کے لیے زیر غور ہوتے ہی ہیں ۔وہاں پر جانے کے لیے سواری کا انتخاب بھی دھیان سے کرنا پڑتا ہے۔اور چونکہ ہم سفر کو بوجھ سمجھ کر نہیں انجوائے کرتے ہوئے کرنا چاہتے ہیں ۔تو سوچتے ہیں کہ جب ایک کام کرنا ہی ہے تو کیوں نہ خوش ہو کر کیا جائے۔تو اس کے لیے سواری کا انتخاب بھی جھٹ پٹ نہیں بلکہ دیکھ بھال کر ہی کرتے ہیں ۔جیسے پہلے پاکستان جاتے ہوئے آنکھیں بند کر کے کچھ محبّ وطنی سے چور پی آئی اے سے جاتے تھے۔لیکن جب اس سے پہلے والی تسلی نہ رہی تو عرب امارات کی فلائیٹ سے جانے لگے۔انگلینڈ جانے کے لیے برٹش ائرویز اور لفتانزا ،کے ایل ایم کی خدمات لے لیتے ۔اور اب کینیڈا جانے کے لیے ائرٹرانزٹ اور کے ایل ایم کی فلائیٹس سامنے تھیں ۔تو پچھلی بار ائرٹرنزٹ کو موقع دیا تھا اور اس بار کے ایل ایم کو ترجیح دے دی۔سوچا پیرس تو پتہ نہیں کب دیکھنے کو ملے ،چلو کم از کم فرانسیسی حسینائیں ہی دیکھ لیں گے۔۔

آٹھ گھنٹے کا سفر تھا۔پاکستان جتنی مسافت تھی ۔ایم پی تھری پلیئر بھی بیگ کے کسی کونے میں پڑا تھا۔لیکن انگلش ٹی وی کے دلچسپ پروگرام دیکھتے اور لائٹ میوزک سنتے پھر وقت ٹھہرا نہیں ۔اور کچھ وقت اس دنیا ،سماج سے دور بادلوں کے سنگ ،آسماں کی بلندیوں پر تخیل کے ساتھ بھی گزرا۔میری ایک دوست کو جہاز میں سفر کرتے ہوئے ڈپریشن ہو جاتا ہے۔ایک بار میں نے اس کی اس کیفیت کا راز جاننا چاہا تو اس نے بتایا کہ اسے دوران پرواز ایک عجیب طرح کی گھٹن سی محسوس ہونے لگتی ہے۔کہ جیسے سب کچھ بند سا ہو گیا ہے ،اب اگر جہاز کو کچھ ہو گیا تو۔۔، بچنے کا کوئی چانس نہیں ۔اس کے خیال اور سوچ

کوذہن میں رکھتے ہوئے جب میں نے اپنی یہ کیفیت محسوس کرنے کی کوشش کی تو مجھے لگا کہ،

اب سر پہ آسماں ہے نہ پیروں تلے زمیں
لے آئی کس مقام پہ اے زندگی ہمیں

سو جب اپنے پیروں تلے زمیں محسوس نہ ہوئی تو بے اختیار دعائیں لب پہ آ گئیں۔ واقعی زندگی کی اصل حقیقت جاننے کے لیے کبھی کبھی خود کو کسی تجربے کی بھٹی کی نذر کرنا پڑتا ہے۔ ویسے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ سفر اور ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے راضی خوشی رہتے ہیں۔ کبھی جہاز میں طبیعت مالش نہیں کی۔ اس لیے جہاز والے خوامخواہ ہی ہماری سیٹ کے آگے والے خانے میں ایک خالی پیپر بیگ رکھتے ہیں۔ اور ادھر ائر ہوسٹس ہر بار وہ جو اچانک ناگہانی حالات سے نمٹنے کا مظاہرہ کرتی ہے وہ بھی اتنی بار دیکھ چکے ہیں کہ ازبر ہو چکا ہے۔ کبھی کبھی تو دل کرتا ہے کہ اسے کہہ دیں،

:بی بی تم یہ جو بادل نخواستہ روبوٹ کی طرح دکھا رہی ہو۔ خوب تھک چکی ہو گی۔ کبھی ہمیں بھی موقع دو۔ آزما کر دیکھو۔ تم سے زیادہ جذب دل سے مسافروں کو کر کے دکھائیں گے۔:

ورنہ ہمیں اچھی طرح اندازا ہے تمہارے جری ہونے کا۔ ایک بار پرواز کے دوران جہاز کو کچھ ہو گیا تھا اور پائلٹ نے بھی حالات کچھ مخدوش ہونے کی اناونسمنٹ کر دی تھی۔ تبھی چائے ہی تو ابھی سرو کی تھی۔ تو بی بی، جس طرح تم مسافروں کے ہاتھوں سے سینڈوچ چھین کر اپنی سرونگ ٹرالی میں ڈال کر بھاگی تھیں۔ وہ منظر آج بھی ہماری نظروں میں محفوظ ہے۔۔۔

اور وہ گولف ائیر لائن۔۔ جس میں صرف ایک ہی بار سفر کیا تھا اور دوبارہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ جس نے مسقط ائر پورٹ کے رن وے پہ ہمارا سامان بکھیر دیا تھا۔ اور ائر پورٹ کے عملے نے آ کر آرڈر

دیا تھا کہ ہم خود اپنا اپنا سامان آ کر تلاش کریں اور ہم مسافر ہکا بکا مسکینوں کی طرح سامان کے ڈھیر میں سے اپنے اپنے سوٹ کیس ڈھونڈ کر نکال رہے تھے۔اس وقت نہ دیس میں تھے نہ پردیس میں۔۔کہاں لاکر صیاد نے جال پھینکا تھا۔سو اس لیے اب ہر سفر کے بعد ہم ائیر لائن کو نمبر دیتے ہیں،اور یہ بھی اچھی طرح جان چکے ہیں کہ میزبان کیوں پوچھتے ہیں کہ،

:آپ کا سفر کیسا رہا؟
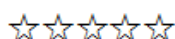
ٹورنٹو

سفر وقت مقررہ کے اندر طے ہوا۔ کینیڈا جوں جوں قریب آ رہا تھا۔ دل بھی پر جوش ہوا جا رہا تھا۔ سفر اب پیچھے چھوٹ رہا تھا اور منزل بس دو چار گام ہی لگتی تھی۔ ویسے جہاز میں لگی ٹی وی سکرین کے حساب سے تو کب کے کینیڈا میں داخل ہو چکے تھے۔ لیکن ابھی اٹاوا کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ جو کہ وہاں کے عزیز ہمیں بتا چکے تھے کہ بائی روڈ ٹورنٹو سے اٹاوا بہت دور ہے۔ کیونکہ پہلے کچھ عزیز وہاں پر ہی ہوا کرتے تھے اور اب وہ بھی ٹورنٹو کے قرب و جوار میں شفٹ ہو چکے تھے۔ ٹھیک آٹھ گھنٹے کے بعد جہاز کینیڈا کے مشہور شہر ٹورنٹو کے انٹرنیشنل پیئرسن ائیر پورٹ پر اتر گیا۔ جہاز کی کھڑکی سے وہ بڑی بڑی ہائی بلڈنگز جو کسی کھلونے کی مانند نظر آ رہی تھیں اب ہمارے روبرو ہو چکی تھیں۔ آگے میزبان منتظر تھے۔ دن بھی اچھا تھا روشن کھلا کھلا سا، موسم بھی معتدل تھا۔ ہوا میں نہ تو ٹھنڈک تھی اور نہ ہی گرمی۔ یہاں صبح کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ ابھی کینیڈا میں مارننگ ہی چل رہی تھی۔ جرمنی میں اب شام کے ساڑھے پانچ کا وقت ہو گا۔ یہ حساب بھی فوراً ہو گیا۔۔

میزبان تین چار کھانے کی ڈشیں بنا کر اور چکن بریانی کو دم پر رکھ کر ہمیں ریسیو کرنے آ چکے تھے اور بار بار یہ نوید دے رہے تھے کہ گھر پہنچتے تک کھانا بالکل تیار ہو گا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کی اس بات پر میں بمشکل اپنی مسکراہٹ روک پاتی۔ ادھر جہازی میزبانوں نے ہماری بھرپور خاطر داری کی تھی۔ کھانے کے مینو کے علاوہ بھی انھوں نے گرم گرم پزا اور تھوڑی دیر بعد ٹھنڈی ٹھنڈی آئس کریم سرو کی تھی۔ سو ان کی میزبانی سے کوئی گلہ باقی نہ تھا۔ گو اس بات کی اہمیت سے بالکل انکار نہیں کہ لمبے سفر کے بعد مسافر دو طرح سے نڈھال ہوتا ہے۔ ایک تو تھکاوٹ اور دوسرا بھوک، اسی لیے شائد میزبان اس خدشے میں

تھے کہ پتہ نہیں دوران پرواز جہاز والوں نے ٹھیک سے خاطر بھی کی یا نہیں، کیونکہ اکثر لوگ سفر کے بعد جہازی کھانے سے کچھ مطمئن نظر نہیں آتے۔ کچھ سال پہلے عمرہ کیا تھا۔ ایک گروپ کے ساتھ دس دن کا پروگرام تھا۔ واپسی پر تھکاوٹ سے سب کا اتنا برا حال تھا کہ سب کے پاؤں پہ بہت سوجن ہو چکی تھی۔ اس گروپ میں ایک بہن بھائی بھی تھے تو وہ لڑکی واپسی پر اپنے دل کی خواہش یہ بتا رہی تھی کہ میں تو گھر جاتے ہی گرم پانی کے باتھ ٹب میں بیٹھ جاؤں گی اور گھر والوں سے کہوں گی کہ میرے لیے گوشت بھونیں۔ اس کی یہ خواہش سن کر سب ہنس پڑے تھے۔ کیونکہ ان دس دنوں کے دوران نہ تو کسی کو کھانے کی فکر تھی اور نہ ہی سونے کی، ایک ایک لمحہ وہاں قیمتی تھا اور اس وقت کچھ ایسی ہی خواہشات محسوس ہو رہی تھیں کہ گھر پہنچتے ہی گھر والے ہمیں ہاتھوں پر اٹھا لیں۔ سو میزبانوں کی پوری تسلی کی کہ اب آپ کی محبتوں کے حوالے ہیں۔ آپ کی محنت اور محبت کو رائیگاں نہیں جانے دیں گے۔

میزبان کا گھر ائر پورٹ سے پون گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا۔ کینیڈا کی سرزمین پر قدم رکھ کر محسوس ہو رہا تھا جیسے دوبارہ محبوب کی گلیوں میں آ گئے ہوں۔ اس لیے بغور کینیڈا کے نظاروں کو اپنی آنکھوں میں جذب کر رہے تھے۔ جب بھی پاکستان جائیں تو لاہور ائر پورٹ سے نکلتے ہی ہمیں فوراً اندازہ ہونے لگتا ہے کہ اب یہاں ہماری غیر موجودگی میں کیا نیا بنا ہے، کونسا ابھی تک ادھورا پڑا ہے۔ کونسی روڈ نئی بنی ہے، کونسا ڈھے گیا ہے، اور یہی چیز لاشعوری طور پر ہماری گنہگار آنکھیں یہاں بھی تلاش کر رہی تھیں۔ لیکن چار سال کا وقت ندی کی طرح بہہ چکا تھا اس لیے کوئی سرا ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔ جب میزبان نے خود ہی بتانا شروع کر دیا۔ گویا ٹیلی پیتھی کے ذریعے وہ ہمارے دل کا حال جان گئے ہوں۔ اور اب وہ ہمیں بتا رہے تھے کہ،

: یہ پلازا نیا بنا ہے، یہ سٹور نیا کھلا ہے، یہ سکار بو سینٹر ہے، اس طرف فلاں کا گھر ہے، ادھر ہمارے ڈاکٹر ہیں، یہ سٹور بھی نیا بنا ہے، یقیناً جرمنی میں بھی ہوگا۔؟ یہ فلاں دوست کا گھر ہے۔ یہ ہوسپٹل ہے۔:

:لو کر لو گل:

اچانک دواؤں کی کلوروفوم جیسی بو ہمیں ناک میں محسوس ہونے لگی اور ایک چکر سا آتا محسوس ہونے لگا۔ اور ہم نے بے اختیار اپنا ہاتھ ناک کے آگے رکھ لیا۔

:یا اللہ خیر، ہم کو اپنی امان میں رکھیو، ہم کوئی اتنی دور سے انھیں دیکھنے تھوڑی آئے ہیں۔: ہم دل میں گھبرا اٹھے۔

میزبان خاتون بچوں میں مصروف تھی۔ کبھی کبھی اس کی آواز ابھرتی اور باتیں سن کر مسکرانے لگتی کہ اتنے میں میزبان کی آواز دوبارہ ابھری،

:یہ اس روڈ پر آگے جا کر بائیں پھر تھوڑا سا آگے دائیں جا کر ٹریفک سگنل سے ٹرن لے کر ساتھ ہی تھوڑا آگے بائیں طرف فلاں رشتے دار کا گھر ہے۔:

:ویسے کیا جرمنی میں راؤنڈ اباؤٹ ہوتے ہیں؟: میزبان نے پوچھا

اور ہمیں جواب کا موقع دیئے بغیر پھر بولے

:اور یہ لیجئے، ہمارے گھر کا قریبی وال مارٹ آ گیا ہے، اس کے ساتھ ہی نوفرلز، کھانے پینے کی اشیاء کا سٹور ہے۔ جہاں ایشیائی چیزیں بھی کھانے کی مل جاتی ہیں۔ ویسے ہم ایسی شاپنگ زیادہ تر اقبال فوڈ سے کرتے ہیں۔ اور یہ رہی ساتھ ہی لائبریری، یہاں اردو کے میگزین، ناول، اخبار جہاں بھی مل جاتا ہے

۔:

لائبریری کے نام نے ہمارے لیے جاں فزاء بوٹی کا کام کیا۔ یہ بوٹی اگر ہمیں پہلے ہی سنگھا دیتے تو کیا

حرج تھا۔ہم نے دل میں میزبان سے گلہ کیا۔خیر اب آپ بتا کر بے شک بھول جائیں لیکن ہم لائبریری کو خوب یاد رکھیں گے۔ہم نے بھی ٹیلی پیتھی کے ذریعے انہیں پیغام رسی کی۔

"لیجئے اپنا گھر بھی آ گیا۔" میزبان کی پر مسرت آواز سنائی دی۔

: ماشاءاللہ،بسم اللہ: کہہ کر ہم نے میزبان کی نئی چمچماتی کالے رنگ کی نسان گاڑی سے باہر قدم رکھا۔

اور۔۔۔

سفر کا اگلا سنگ میل آ چکا تھا۔

لوگ اور ملک

بہت سے لوگ امریکن گرین کارڈ ہولڈر بن کر بہت فخر محسوس کرتے ہیں۔ جیسا پچھلے وقتوں لوگ ولایت جا کر خوش ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب یہ بات کبھی کبھی حیران کن لگتی کہ ایسی کیا بات ہو گئی ہے کہ اب لوگ، انگلینڈ یورپ کے اوپر سے شوں کر کے گزر جاتے ہیں۔ اور امریکہ کی بجائے بھی کینیڈا میں قیام کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ انگلینڈ کے ایک ٹی وی چینل سے امیگریشن والوں کا پروگرام آتا تھا۔ جس میں زیادہ تر لوگ کینیڈا ٹرانسفر ہونے کے لیے سوالات کیا کرتے تھے۔ اور اس تبدیلی کی بدولت اچھے خاصے سیٹل لوگ بھی کینیڈا جا کر ٹیکسی چلا رہے تھے۔ اپنی اچھی بھلی جاب، کیریر چھوڑ کر وہاں جا کر اک نئی جدوجہد میں پڑ رہے تھے۔ یہ بات کچھ پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ ان گنت سوالات اٹھتے تھے۔

؛کیا لوگوں کا ولایت سے دل بھر گیا ہے ؟

:یا لندن کی اب وہ بارش اچھی نہیں لگتی ؟

یا ملکہ کی بادشاہت سے بیزار ہو چلے ہیں؟

جب پورا یورپ یونین میں ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہو رہا تھا اور سب ملکوں کی کرنسی یورو میں تبدیل ہو رہی تھی تب صرف انگلینڈ اس پروگرام میں شامل نہیں ہوا تھا تو انگلینڈ سے ایک رشتے دار نے فخر یہ کہا تھا کہ،

:دیکھ لیں ہماری کوئین نہیں مانی اور وہ پونڈ کے بدلے یورو کرنسی پر نہیں آئی۔:

:واللہ، کیا کہنے کوئین کے؟

ہم پہلے ہی کوئین کی ڈیڑھ اینٹ کی بنیاد رکھنے پر جز بز ہو چکے تھے۔ خیر، وہ عقدہ تو بعد میں کھل گیا تھا،

جب کینیڈا جا کر کنیڈین ڈالر کی کرنسی دیکھی کہ وہاں دو ڈالر کے سکے پر بھی ملکہ براجمان تھیں۔ جب اس بات کی تاریخ جاننا چاہی تو پتہ چلا کہ خالص کنیڈین لوگوں کا شجرہ نسب بھی کہیں نہ کہیں جا کر ملکہ الزبتھ اور انگلینڈ سے جا جڑتا ہے۔ اسی لیے انگلینڈ والوں کی بھی کینیڈا جا کر بسنے کے لیے محبت ٹپک پڑتی ہے۔ تبھی یہ قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ آپ نے فلم۔۔ ایک پھول دو مالی۔۔ تو دیکھی ہوگی۔ بس یہاں بھی کچھ ایسا ہی سلسلہ نظر آتا ہے۔۔

کینیڈا دنیا کا ایسا ملک ہے جہاں دنیا بھر کے لوگ ایک پلیٹ فورم پر شیر و شکر نظر آتے ہیں۔ ورنہ کسی بھی ملک جاؤ تو سب سے پہلے اسی ملک کے باشندے سب سے زیادہ تعداد میں ہوتے ہیں۔ اس کے بعد باقی کچھ ملکوں کے لوگ بطور اقلیت در پردہ سہمے سہمے سے رہتے ہیں۔ جیسے جرمنی میں سب سے زیادہ تو جرمن لوگ خود ہیں۔ اس کے بعد روسی لوگ ذرا دھڑلے سے رہتے ہیں۔ پھر ترکی اور عربی لوگوں کی تعداد بھی ہے۔ چینی لوگ تو یہاں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔ باقی پاکستانی، ایرانی، سری لنکا، ہندوستانی، بنگالی لوگ اقلیت بن کر خال خال ہی ہیں۔ اس لیے حکومتی سطح پر بھی انہیں اگنور کر دیا جاتا ہے۔ ووٹ یہ نہیں ڈال سکتے۔ ان کی زبان کو بھی پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ ان کے لیے کونسلنگ بھی نہیں۔ لائبریری میں کتابیں نہیں۔ بندہ بیک وقت دو قومیتیں نہیں رکھ سکتا۔ اور انگلش زبان بھی یہاں نہیں۔ تو اس ملک میں رہنے والوں کو چار و نا چار جرمن زبان سے ہی جڑنا پڑتا ہے۔ چاہے بولنے والے گرائمری سطح پر اس کی ٹانگ توڑتے جائیں۔ لیکن اس کے باوجود کچھ باتیں ایسی ہیں کہ پھر بھی لوگ اس ملک سے جڑے رہتے ہیں جیسے،

جرمنی کا میڈیکل بہت اچھا ہے۔

بلاتفریق غیر ملکی لوگوں کے پاس بھی اچھی ،نئ اور بڑی گاڑیاں ہوتی ہیں ۔جنہیں دیکھ کر جرمن دل میں تو ضرور کلستے ہوں گے لیکن کچھ کرنہیں سکتے ۔پھر یہاں کافی اچھی یونیورسٹیاں موجود ہیں ۔اس لیے یونیورسٹی کے سٹوڈنٹ بھی اکثر نظر آتے ہیں ۔خیر یہ تو اسی طرح ہر ملک میں اچھے رخ بھی ہوں گے اور ساتھ مسائل بھی ہوتے ہوں گے ۔

اور اس صورتحال کے برعکس ۔۔۔!

کینیڈا ایک ایسا ملک ہے، جہاں ساری دنیا چلی آئی ہے ۔فرنگی ، فرانسیسی ، یونانی ،فلپین ، پاکستانی ، ہندوستانی ،چینی ،عربی ، پولش ، پرتگالی ، افغانی ،مصری ،حبشی ، یہودی ، اٹلی ،میکیسیکو ، جاپانی ، ھسپانوی ،کورین ، جرمن اور کئی دیگر اقوام کے لوگ نظر آتے ہیں ۔اور آئے دن ان کی سکونت یہاں بڑھتی چلی جارہی ہے ۔ذاتی طور پر مجھے کینیڈا اچھا لگا ۔شائد اس لیے کہ وہاں لوگ سرحدوں سے بے نیاز ہیں ۔اپنی زبان روڈ پر کھڑے ہوکر آرام سے بول لیتے ہیں ۔منہ بنا بنا کر انگلش سے منہ ماری نہیں کرتے ۔اپنے ملکی لباس آرام سے پہنتے ہیں ۔یہ ڈر ،ہچکچاہٹ نہیں کہ لوگ کیا کہیں گے ۔ملٹی نیشنل لوگ ہیں تو ان کے اپنے بازار ہیں ۔خود کنیڈین لوگ کم بلکہ پس پردہ نظر آتے ہیں ۔پھر جگہ جگہ پاکستانی ، انڈین ، چائینیز ریسٹورنٹ ہیں ۔ ہر علاقے میں لائبریری موجود ہے ۔جس میں ہر قومیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی زبان کی کتابیں موجود ہیں ۔ ہر علاقے کی لائبریری میں اردو کتابیں موجود ہیں ۔پاکستانی لوگ زیادہ تر جاب کرتے ہیں ۔ٹیکسی چلاتے ہیں ۔ کسی کسی کا رجحان سٹور وغیرہ پر بھی ہے ۔اور دوکانیں ، ڈرگ سٹور اور اسی طرح کھانے پینے کی اشیاء گروسری وغیرہ کے بھی سٹور ہیں ۔کافی پاکستانی بنک میں بھی کام کرتے ہیں یا دوسری فرموں ، کمپنیوں میں اپنے روزگار پر لگے ہیں ۔اور لگی بندھی تنخواہ میں زیادہ

سہولت محسوس کرتے ہیں۔ بزنس کر کے رسک لینے والا کاروبار ہندوستانی، سکھ لوگ، سری لنکا کے لوگ کرتے ہیں۔ ورنہ بزنس کے معاملے میں چینی لوگ چھائے ہوئے ہیں۔ یا پھر جیرالڈ سٹریٹ پر ایک پاکستانی انڈین بازار ہے۔ وہاں پر خوب پاکستانی اور انڈین دوکانیں ہیں۔ پھر فلموں کے شائقین کے لیے اردو، ہندی فلموں کے سینما موجود ہیں۔ اور جب یہ سارے لوازمات اپنے ملکوں سے دور پردیس میں مل جائیں تو دیس کی خوشبو سی محسوس ہونے لگتی ہے۔۔

ایور گرین اداکار

میں وہیں پر تھی جب مشہور اداکار دیو آنند گزر گئے۔ تو ٹورانٹو کے مقامی ٹی وی چینل پر جیرالڈ سٹریٹ پر بروز ہفتہ ان کی فلم گائیڈ دکھانے کی بار بار اناؤنسمنٹ ہوتی رہی۔ میں پہلے ہی سن کر دکھی تھی۔ گو گائیڈ فلم کئی بار دیکھ چکی تھی لیکن انہیں خراج تحسین پیش کرنے کے لیے سینما جانے کا پروگرام بن چکا تھا۔ اور بڑے پردے پر دیو آنند کی مشہور زمانہ فلم دیکھ پانا ایک اچھی خاصی ایکسائٹمنٹ پیدا کر رہا تھا۔ لیکن اگر قسمت میں نہ ہو تو بندہ کیا کرے۔ اسی روز دوسرے شہر سے کچھ رشتے دار ملنے کے لیے آ گئے۔ اور یوں یہ دن ان کی نذر ہو گیا۔۔

ویسے مقامی ٹی وی نے روزانہ دیو آنند کے بارے میں خبر تفصیل سے دی اور اسے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کی فلموں سے چیدہ چیدہ سین اور پروگرام دیئے۔ جسے ایک کنیڈین گوری پیش کرتی تھی۔ اور جس طرح وہ اس خبر کو انگلش میں دے کر اپنی اردو سپیکنگ ساتھی کو بولنے کا موقع دیا کرتی تو دکھ کی ایک پرچھائی ہمیں اس کے چہرے پر بھی نظر آتی۔ جس سے لگتا کہ غالباً یہ بھی اس انڈین اداکار کو جانتی ہے۔ گویا راجکپور کے بعد دیو آنند بھی اس عالمی شہرت یافتہ کیٹیگری میں آ چکے تھے۔ دیو آنند بلاشبہ ایک ایورگرین اداکار اور پرسنیلٹی تھے۔ جنھوں نے ہمیشہ عمر کو مات دیئے رکھی اور ستر سال کی عمر میں بھی ہیرو کا رول نبھاتے رہے۔ وہ وقت کے ساتھ چلنا جانتے تھے۔ ایک پروگرام میں انھوں نے کہا تھا کہ ان کے لیے آنے والے دس منٹ اہم ہوتے ہیں نہ کہ گزرے ہوئے دس منٹ، اور ہر وقت کچھ نہ کچھ نیا کرنے کا عزم ان میں موجود رہتا تھا۔ بہر حال، اب ان کی یادوں اور فلموں کے حوالے سے ان کی فلمیں گائیڈ، بات ایک رات کی، تیرے گھر کے سامنے، سی آئی ڈی، پے انگ گیسٹ، کالا پانی، لو میرج، مایا،

بمبئی کا بابو، اصلی نقلی ٹیکسی ڈرائیور، نو دو گیارہ، امر دیپ، تین دیویاں، انسانیت اور سپرڈپر فلم ۔۔ہم دونوں ۔۔ ہمیشہ یاد رہیں گی۔ ابھی ایک ڈیڑھ سال قبل ہی انھوں نے اپنی مشہورزمانہ بلیک اینڈ وہائٹ ۔۔فلم ہم دونوں ۔۔کوکلرڈ میں تبدیل کیا تھا اوراس بات پر وہ بہت خوش اورا یکسائٹڈ تھے۔دیو آننداس بات سے بھی کافی شہرت میں آئے کہ اداکارہ ثریا ان کی محبوبہ تھی ۔اور بعد میں ان کی شادی بھی ایک ایسی اداکارا سے ہوئی تھی جو واقعی بہت خوبصورت تھی ۔جس کا نام تھا کلپنا کارتک،اس کے ساتھ انھوں نے فلم بازی، ہاؤس نمبر۴۴ اورنو دو گیارہ فلم میں کام کیا تھا۔وہ ایک ایورگرین اداکار تھے۔یوں دیوآنند کے گزرجانے سے ہندی سینما کی تاریخ کا ایک باب اورختم ہوگیا لیکن اس اداکار کا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔۔۔

چینی ریسٹورنٹ

کینیڈا چونکہ پہلے بھی جانا ہوا تھا۔ اس لیے سب کچھ دیکھا بھالا اور اپنا سا ہی لگ رہا تھا۔ پھر بھی ہر بار کچھ نہ کچھ نیا ضرور دیکھنے کو ملتا ہے۔ جگہیں بھی، ریسٹورنٹ بھی، لوگ بھی، اور ان کے درمیان اپنی ہستی کو جانچنا ایک اچھا خوشگوار تجربہ لگتا ہے۔ وہاں جاتے ہی دوسرے روز میزبان اپنی میزبانی نبھاتے ڈنر کے لیے باہر لے گئے۔ پاکستانی، انڈین، چائنیز کھانے سرفہرست تھے۔ سو چائنیز کھانے کا پروگرام بنا۔ دل نے سوچا چلو اسی بہانے آتے ہی چینی لوگوں کا بھی وافر دیدار ہو جائے گا۔ اور انھیں تین انگلیوں کے ساتھ دو اسٹک سے کھانا کھاتے دیکھنا بھی کسی خوشگوار تجربے سے کم نہ ہوگا۔۔

لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ اول وقت ساڑھے چھ بجے ہی وہ ریسٹورنٹ پاکستانی اور انڈین لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہاں کا ماحول اور اس کے در و دیوار ضرور چائنا کی ثقافت پیش کر رہے تھے۔ مگر اس ثقافت کو پیش کرنے والے لوگ انڈین اور پاکستانی تھے۔ تھوڑا سا ساڈارک ماحول اچھا لگ رہا تھا۔ کافی رش بھی ہو رہا تھا۔ لوگ جیسے کھانے پہ ٹوٹے پڑے تھے۔ وہ اپنے آپ میں اتنے مگن تھے کہ میرا نہیں خیال کہ انھوں نے ہمیں اندر آتے اور فرصت سے بغور دیکھا ہوگا۔ اندر آتے ہی ہم نے اپنے لیے کسی پرسکون گوشے کی تلاش شروع کر دی۔ مجھے یہ بات ہمیشہ ہی دلچسپ لگتی ہے کہ کسی بھی ریسٹورنٹ میں داخل ہو کر کچھ لوگ بیٹھنے کھانے، پینے کے لیے کسی ایسے کونے کو ترجیح دیتے ہیں، ڈھونڈتے ہیں، جہاں وہ ایک طرح سے گوشہ نشین ہونا چاہتے ہیں کہ وہ لوگوں کی نظروں میں آئے بغیر سکون سے بیٹھ کر اپنے کھانے سے لطف اندوز ہو سکیں۔ اور دوسری طرف کچھ مہربان اندر داخل ہو کر ایسی ٹیبل ڈھونڈتے ہیں جو باہر کھڑکی کے برابر ہو۔ اس طرح وہ اپنی ذات سے بے پرواہ ہو کر نہ صرف اپنا کھانا انجوائے کرتے ہیں بلکہ باہر کی

دنیا کی گہما گہمی سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور موسم کی بھی خیر خبر رکھتے ہیں۔۔

سو ہم ہی کوئی اچھی سی میز ڈھونڈتے ہوئے ان کے درمیان سے گزرتے رہے۔ گو ہمارے پاس زیادہ انتخاب کا موقع نہیں تھا۔ گنتی کی دو تین میزیں ہی خالی ہوں گی۔ سو ایک جگہ کا انتخاب کر کے وہاں اطمینان سے جا بیٹھے۔ پلک جھپکتے میں ہی ویٹر سادہ پانی اور مینو کارڈ لے آیا۔ اور آرڈر لینے کے بیس منٹ بعد چکن منچورین، چکن چلی، فرائڈ ایگ رائس، سبزیاں اور میکرونی، تلی ہوئی مچھلی، خوشنما سلاد، مختلف سوس، کوک، سپرائیٹ، جنجر ڈرنک سے میز کی رونق دوبالا ہو چکی تھی۔ گرم گرم کھانا بھوک کی اشتہا کو مزید بڑھا رہا تھا۔ مختلف نعمتوں سے خوان سجے ہوں تو مزید برداشت کا پارٹ پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ سو بسم اللہ، پڑھ کر کھانا شروع کر دیا۔ اور میزبان کے بچے بھی گھر والا ماحول پیدا کرنے لگے کہ میں نے یہ کھانا ہے، میں نے وہ نہیں کھانا۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔ کوک کے جتنے بھی ڈرنک تھے۔ ان پر بچوں نے اپنا حق سمجھتے ہوئے فوراً قبضہ کر لیا۔ اب سپرائیٹ اور جنجر ڈرنک ہم جرمنی والوں کے لیے باقی تھے۔ خیر، ہمیں بھی کوک کی پرواہ کب تھی، وہاں جا کر تو جنجر ڈرنک اور سی پلس ویسے بھی ہمارا پسندیدہ مشروب بن جاتا ہے۔ سو ایک جنجر ڈرنک اٹھا کر اس کا مزے سے سپ لے لیا۔ نیم تاریک ماحول میں کھانا اور لوگوں کی ہلکی ہلکی سرگوشیاں، چھری کانٹے کا تال میل سبھی اچھا لگ رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میزبان خود ہی کھانے کے بارے میں کوئی کمنٹ کرنے لگتے۔ اور کھانے کے اچھا ہونے کے بارے میں ہم سے تائید چاہتے۔ تو جواباً مسکرا کر اور کبھی اظہار کر کے انھیں بتانا پڑتا کہ واہ بھئی چینی باورچی نے کھانا تو خوب بنایا ہے دل لگا کر، نمک مرچ سب پورا ہے جس پر وہ کوئی نہ کوئی کھانے کی ڈش اٹھا کر ہماری پلیٹ میں اور ڈالنا شروع ہو جاتے۔ اس لیے کئی بار یہ تعریف مہنگی پڑ جاتی۔ لیکن دل میں خوشی بھی ہوئی کہ اپنے ملک

سے دور ہو کر بھی یہ روایات میزبانوں کو خوب یاد ہیں۔ سوان کی محبت کا پاس رکھنا پڑا۔ لیکن آئندہ کے لیے اندازہ ہو گیا کہ کہاں تعریف اظہار کے ذریعے کرنی ہے اور کہاں صرف مسکرا کر خاموش رہنا ہے۔

کھانا ابھی جاری تھا۔ جب ایک بے صبرے نے ویٹر کو اپنے آرڈر کی یاد دہانی کرائی۔ تو ویٹر جس کی پھرتیاں عروج پر تھیں، اس نے کہا

:سر، ابھی ابھی آپ کا آرڈر آتا ہے۔ دراصل میں اکیلا ہوں۔:

ریسٹورنٹ کی مبہم سی خاموشی کے ماحول میں یہ آواز گونج کر رہ گئی۔ سبھی نے سنا اور لوگ ہنسنے لگے کہ اتنے مجمع کو صرف ایک ویٹر سنبھال رہا ہے۔ ہمارے میزبان کو بھی کچھ مزید چاہیے تھا، وہ اٹھ کھڑے ہوئے، کہنے لگے،

:وہ اکیلا ہے، اس کی مدد کرنی چاہیے۔ میں خود ہی جا کر لے آتا ہوں۔:

جس پر سب مسکرانے لگے۔
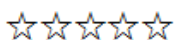
قریبی شاپنگ پلازا

ٹورنٹو کے جس حصے میں میزبان کا گھر تھا وہاں چینی لوگ بہت زیادہ تھے۔ میں وہاں جا کر بھی اپنی واک کرنے کی عادت نہ چھوڑ پائی۔ کبھی کوئی ساتھ مل جاتا ورنہ اکیلی ہی چل دیتی۔ ویسے بھی وہاں سب میری واک کی عادت سے متاثر تھے۔ ورنہ ہر کوئی وقت نہ ہونے کا رونا روتا ہے۔ عورتیں سارا دن مصروفیت کا رونا روتی ہیں۔ حالانکہ اس مصروفیت میں سیر کہیں بھی شامل نہیں ہوتی۔ میں بھی شائد انھی میں سے ایک ہوتی۔ اگر مجھے یہ اچھی عادت اپنے والد صاحب سے نہ ملتی۔ جہاں میں نے ان سے اور بہت کچھ سیکھا، جانا۔ وہیں اس عادت کو بھی پا کر میں ان کے نقش پا پہ چلتی رہی، جبکہ میرا یہی کہنا ہے کہ وقت نکالنا پڑتا ہے۔ بس اٹھ کر واک والے جوتے پہنیں، کوٹ پہنیں اور سیر کو نکل کھڑے ہوں۔ پہلا قدم اٹھانا ہی مشکل ہوتا ہے۔ چند روز اس روٹین کو بے شک زبردستی ہی اپنائے رکھیں۔ بعد میں آپ خود کو اس عادت کا پابند پائیں گے۔ اور سیر کے بے پناہ فوائد ملیں گے۔۔

اسی عادت سے مجبور ایک روز میں سیر کرتے ہوئے گھر کے قریبی پلازا کی طرف جا نکلی۔۔

صبح قریبا پونے نو کا وقت ہو گا۔ وال مارٹ ،نو فرلز، شاپر ڈرگ، بینک اور دوسری چھوٹی بڑی دوکانیں، اچھا خاصا پلازا تھا جہاں چینی لوگ بھی اپنی دوکاں بڑھائے بیٹھے تھے۔ مین دروازے سے داخل ہو کر مجھے سیدھا وال مارٹ میں جانا تھا۔ لیکن میں ٹھٹھک کر رہ گئی۔ چینی لوگوں کی دوکانوں کے مالک اور ورکرز درمیانی داخلی راستے ایکسرسائز میں مصروف تھے۔ ہلکا ہلکا میوزک بج رہا تھا۔ چینی لوگ مسکراتے چہروں کے ساتھ ایکسرسائز میں مصروف تھے۔ اور دو چار نہیں ایک اچھی خاصی کلاس لگی ہوئی تھی۔ لوگ

راستہ رکا دیکھ کر مڑ کر دوسرے متبادل راستے سے وال مارٹ کے اندر جا رہے تھے۔یقیناً وہ یہ مظاہرہ اکثر دیکھتے رہتے ہوں گے۔ پر میرے لیے سر عام یہ کلاس نئ تھی ۔ میں پہلے ٹھٹکی ،پھر متاثر ہوئی ۔دل میں انھیں داد دی۔دل چاہ رہا تھا کہ انھیں دیکھتی رہوں اور دو چار سٹیپ ذہن میں محفوظ کرلوں۔ جو ارد گرد سے بے نیاز اپنی صحت کی فکر میں تھے۔ پر شائد کچھ معیوب لگتا اس لیے ذرا سا راستہ بدل کر اگلی لائن میں مڑ گئی۔یہاں بھی دو چینی لوگ اپنی علیحدہ ہی کلاس لگائے ہوئے تھے۔میں پھر رک گئی۔ میوزک ،ایکسر سائز اور تندرستی کا یہ امتزاج اچھا لگا۔قدم بہ قدم میرے لیے حیرت کدہ بن رہا تھا۔ میرے رکنے پر وہ مسکرانے لگے۔ جواباً مجھے بھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ ان کی نذر کرنا پڑی۔اور پھر ایسا مجھے اکثر اس وقت دیکھنے کو ملتا جب میں سیر کرتی کرتی وال مارٹ کی طرف نکل جاتی۔۔

میں جہاں بھی جاؤں۔جس ملک بھی جاؤں تو،

جس طرح سورج ،چاند،ستارے میرے سنگ چلتے ہیں۔۔

ویسے ہی مجھے فطرت بھی اپنے ہمراہ محسوس ہوتی ہے۔اور میں جہاں بھی گئی ہوں،فطرت کی نئ نئ جگہیں دیکھنے کو ملی ہیں ۔اور مجھے انھیں قریب سے دیکھنے،ان کے سنگ وقت گزارنے کا موقع بھی ملا۔سو مجھے لگتا ہے،پانی ،پہاڑ ،درخت ،پھول ،پودے ،دریا،آسماں، فطرت کے ان رنگوں کی اپنی ہی ایک کہانی ہے، اگر ان پر ذرا سی بغور نظر ڈالی جائے تو یہ آپ کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے۔اور فطرت سے جڑ کر بندہ کائنات اور پھر سیدھا اللہ کی ذات سے جا جڑتا ہے۔

میری کہی یہ نظم بھی میرے کچھ ایسے ہی جذبات کا عکس ہے۔۔

اے مصور!

دور دور تا حد نظر آسماں۔۔

اک وسیع کینوس کی مانند پھیلا ہے

افق کے کنارے اس کی حد بندی کرتے ہیں

صبح اس کے کناروں پر گلابی

اور شام شفق رنگوں کی حاشیہ آرائی کرتی ہے

پردے پر منظر بدلتا رہتا ہے

اک کونے میں آفتاب جگمگاتا ہے

پرندے اڑتے اڑتے کہیں دور جا رہے ہیں

کبھی بدلیاں برستی چلی آتی ہیں اور

کینوس پر بھیگے رنگ بکھر جاتے ہیں

شام ہوتے ہی یہ رنگ اپنی تابنا کی کھونے لگتے ہیں

اداس سا منظر دل میں اترنے لگتا ہے

یکدم کینوس صاف ہونے لگتا ہے

گویا نئی تصویر آنے والی ہے۔۔

سرمئی، کالے رنگ اس پر اترنے لگتے ہیں

اب یہ اک آنچل کی مانند دراز لگتا ہے

جگنو سے ستارے اس پہ ٹھہر جاتے ہیں

ستارے جو ٹمٹماتے ہیں کبھی جگمگاتے ہیں

یکدم چاند اجاگر ہو کر اس منظر کو گویائی بخشتا ہے

اور دل کے اندر جاگزیں ہونے لگتا ہے

اتنی خوبصورت، اتنی پیاری منظر کشی کرنے والے

اے مصور، اے تخلیق کار

تری تخلیق دیکھ کر زباں گنگ ہے۔۔۔

اور بے اختیار ترے آگے سر بسجود ہونے لگتا ہے

ٹورنٹو کی لائبریری

وال مارٹ کی پچھلی سائڈ پر سامنے ہی لائبریری تھی۔ جو میری پسندیدہ جگہ تھی۔ لائبریری میں ساری کمیونٹی کے لوگوں کے حساب سے کتابوں کا انتخاب موجود تھا۔ لائبریری کے اندر مجھے پاکستانی لوگ بہت کم نظر آئے۔ یہاں پر بھی چینیوں کی بہتات تھی۔ لیکن مجھے پھر بھی خوشی تھی کہ کچھ تو ہم ذوق ملے۔ اردو کتابوں کی اک بڑی کولیکشن موجود تھی۔ جسے دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ اردو کتابوں کے اگلے سیکشن میں ہی ہندی کی کتابیں بھی نظر آرہی تھیں مگر بہت کم تعداد میں، پر اردو کی تو اتنی بڑی کولیکشن دیکھ کر میرا تو دل ست رنگی ہو چکا تھا۔۔

مستنصر حسین تارڑ، اشفاق احمد، انتظار حسین، ابن انشاء، قتیل شفائی، وصی شاہ، ہاشم ندیم، ایم راحت، پروین شاکر، کشور ناہید، رضیہ بٹ، سلمی کنول، عمیرہ احمد، نگہت سیما، فرحت اشتیاق، عفت سحر پاشا، عائشہ مرتضی، فائزہ افتخار، ماہا ملک، عصمت چغتائی، واجدہ تبسم، اس کے علاوہ بک ہوم کی بیسٹ سیلرز کتابیں موجود تھیں۔ ہر بار جانے پر پہلی کتابیں نظر نہیں آتی تھیں اور ان کی جگہ نئی نئی کتابیں نظر آتیں۔ سو اس سے دل کو تسلی ہوئی کہ پاکستانی لوگ مجھے لائبریری کے اندر بھلے نظر نہ آئیں، مگر اردو لٹریچر سے وہ جڑے ضرور ہیں۔ سو پھر میں نے اپنے دل کی خوب کی۔ اور بے شمار کتابیں پڑھیں۔ روزانہ رات کو ایک کتاب میرے تکیے کے نیچے دبی ہوتی۔ ہر دن، اک نیا دن بن کر آتا۔ ملنا ملانا، شاپنگ، دعوتیں، سیریں، غرض دن اک ہنگامے کی نذر ہو جاتا۔ تو رات کو بیڈ میں لیٹ کر جونہی کسی اچھے

رائٹر کی کتاب ہاتھ میں لیتی، پھر ساتھ آہستہ آہستہ کبھی مٹھائی، کبھی بیسن کے لڈو، کبھی کیک کا پیس کھاتے ہوئے گرم دودھ پیتی تو لگتا کہ آدھی تھکاوٹ دور ہوگئی۔ پھر رات گئے تک مطالعہ کرتی۔ اور کتاب پڑھتے پڑھتے جب نظر اٹھا کر وال ٹو وال گلاس ونڈو سے باہر دیکھتی تو ٹورنٹو شہر کی دور تک پھیلی ہوئی روشنیاں آنکھوں کو خیرہ کرتیں اور میں اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلی آتی۔ رات ہو کر بھی رات نہ لگتی۔ پورا شہر اک جھلمل جھلمل کرتی چادر اوڑھے ہوتا۔ رات خاموش ہوتی اور اس کی خاموشی کا یہ فسوں بہت کچھ کہہ دیتا۔ اور کبھی کبھی وجد کا کوئی لمحہ میرے قریب آ جاتا،

ٹورنٹو

ٹورنٹو شہر کی اک بلڈنگ

دسویں منزل کی اک کھڑکی

باہر دور تک کا منظر عیاں کر رہی ہے

فطرت اور بلڈنگ ۔۔اونچائی اور نیچائی

جانے لوگ یہاں زمیں پر رہنا پسند کیوں نہیں کرتے

افق کا کنارا کہیں کھو سا گیا ہے

نیچے گاڑیوں کی قطار، لوگوں کی بہتات ہے

کوئی بھی فرصت سے نظر نہیں آتا۔۔

ملک ملک کے باشندے، سرحدوں سے آزاد ہو گئے ہیں

آج صبح اس حبشی عورت نے مجھے سلام کہہ کر متحیر کر دیا

مسکرا کر جواب دیتے اسے اپنا سا ہی محسوس کیا

امراء کے علاقے۔۔

بیگم پورہ نے مغلپورہ اور باغبانپورہ کی یاد دلا دی

رات کو یہ شہر روشنی کی چادر اوڑھ لیتا ہے

جھلمل جھلمل ہر سو اس کا آنچل لہراتا ہے

وہ دور سے سی این ٹاور اور ڈاؤن ٹاؤن نظر آ رہا ہے

یقیناً وہاں زندگی اور بھی جواں ہو گی

ساقی ہو گا، مے ہو گی اور رنگیں رات ہو گی

رات گئے تک یہ محفل عروج پہ گلگف رہتی ہے

پو پھٹتے ہی دیوالی ختم ہو جاتی ہے

زندگی ٹھہر جا، رک جا کیا جلدی ہے

آخر کو پھر وہی۔۔

صبح کی جوگن اور شام کی بیراگن ہی تری منتظر ہو گی

☆☆☆

میز بان کے قصے

مزے کی بات یہ رہی کہ میز بانون کا لائبریری کارڈ اتنا ان کے کام نہیں آیا تھا، جتنا میرے کام آ رہا تھا۔سو وہ بھی خوش تھے کہ اب ان کے گھر بھی ادب کے رسیا موجود ہیں۔اور اب وہ بھی اپنے حلقہ دوست احباب میں اس بات کا خوشی سے تذکرہ کر سکیں گے۔ویسے میز بانوں کے دوست احباب کی بیگمات کو جب میرے مطالعہ کے وصف کا پتہ چلا تو چند ایک نے اپنے پاس خواتین،شعاع، پاکیزہ ڈائجسٹ کی پوری کولیکشن ہونے کی اطلاع دی۔اور مجھے اس سے مستفید ہونے کی آفر بھی کی۔لیکن بندہ خود ہی سوچے کہ جب پیاسے کو پیاس بجھانے کے لیے پورا کنواں مل رہا ہو تو صرف چند ڈول پانی لینا کون چاہے گا۔سو ان کی آفر پر بس شکریہ کہنے پر اکتفا کیا۔میز بان خاتون بھی ابھی حال ہی میں پاکستان ہو کر آئی تھی تو وہ بھی باورچی خانہ، کچن، مصالحہ میگ،ڈالڈا کا دستر خوان، کچھ ناولز اور اسلامی کتابیں بھی لائی تھیں۔بچوں کی مصروفیت کے ساتھ ساتھ اس شوق سے جڑے رہنا عام لوگوں کا کام نہیں، شائقین ادب ہی ایسا کر پاتے ہیں۔سو ان کے ساتھ کبھی کبھی ادبی گفتگو ہو جایا کرتی تھی۔وہ عمیرا احمد کی زبردست فین تھیں۔اب کافی کچن کے شیف میگزین کی کولیکشن اس کے پاس تھی تو کبھی کبھی وہ اور کبھی میں اس میں سے کوئی نئی ریسپی ڈھونڈ کر اس پر شوقیہ طبع آزمائی کرتے۔وہ ایک خاصی سوشل اور باتیں کرنے والی میز بان تھی اس لیے بور ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔وہ مجھے کافی ادھر ادھر کے قصے سنایا کرتی۔اس نے بتایا کہ جب کچھ سال پہلے وہ اس ہائی بلڈنگ کے گھر میں آئی تو بلڈنگ میں رہنے کے طریق کار کا زیادہ پتہ نہ تھا کہ چند روز بعد ہی ایک صبح شوہر کے جاب پر جانے کے بعد وہ دوبارہ بیڈ چلی گئی تو تھوڑی دیر بعد بلڈنگ کا فائر الارم بجنا شروع ہو گیا۔فائر الارم بجتے ہی وہ گھبرا کر

اٹھی اور اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر دیکھا، میرا خیال تھا کہ آگ بجھانے والے الارم کی آواز سن کر سب لوگ تیزی سے سیڑھیوں کی جانب بھاگے جا رہے ہوں گے۔ لیکن باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ اتنے میں الارم بھی بند ہو گیا تو اک کشمکش کا شکار میں دوبارہ بیڈ چلی گئی۔ پانچ منٹ بعد الارم پھر بجنا شروع ہو گیا۔ تب لگا کہ واقعی کوئی گڑبڑ ہے تو میں نے جلدی سے پاسپورٹ نکالے، جیولری نکالی اور ایک بیگ میں ڈال کر گھر سے باہر نکل آئی۔ دیکھا تو باہر کوریڈور پورا خالی تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اور الارم تھا کہ متواتر بجے ہی چلا جا رہا تھا۔ ابھی یہاں آئے کچھ ہی روز ہوئے تھے اس لیے ہمسائیگی سے بھی واسطہ نہ پڑا تھا۔ تب میں نے ہچکچاتے ہوئے اپنے اگلے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تین چار بار تیزی سے کھٹکھٹانے پر ایک آدمی نے دروازہ کھولا۔ اگلا گھر کسی سری لنکا فیملی کا تھا۔ تو دیکھا کہ ایک دھوتی میں ملبوس کالے سے رنگ کا الجھے بالوں والا آدمی آنکھوں میں نیم خوابیدگی لیے میرے روبرو کھڑا تھا اور حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے اسے انگلش میں کہا کہ،

: یہ فائر الارم بج رہا ہے۔ پتہ نہیں کہاں آگ لگی ہے۔ میں فکرمند ہوں، میرے شوہر بھی گھر پر نہیں ہیں، سمجھ نہیں آ رہی کہ میں کیا کروں۔؟

تو غالباً اس آدمی کو کم کم انگلش آتی تھی پر بڑے آرام سے کہنے لگا،

: نونو، ناٹ وری وری، گو اینڈ سلیپ سلیپ۔۔ یعنی فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔ جاؤ اور جا کر سو جاؤ۔۔:

تب میری جان میں جان آئی۔ بعد میں جا کر پتہ چلا کہ یہ بلڈنگ کا فائر الارم سسٹم اسی طرح چیک کیا جاتا ہے۔ سو اب جب بھی فائر الارم بجتا ہے تو میں مسکرا اٹھتی ہوں۔

☆☆☆☆☆

ہائی بلڈنگز

ٹورنٹو کی خاص بات اس کی بڑی بڑی ہائی بلڈنگز ہیں۔اونچی اونچی عمارتیں اور بلڈنگیں تو دنیا کے اور ملکوں میں بھی ہیں۔پر کینیڈا میں شہروں کے اندر کافی بڑی بڑی ہائی بلڈنگز ہیں۔خاص طور پر ڈاؤن ٹاؤن کے قریب تو بہت بڑی بڑی بلڈنگز ہیں۔سب سے نچلی بلڈنگ بھی دس منزل سے کم نہیں، پھر پندرہ، چھبیس منزلہ بلڈنگز بھی بہت نظر آتی ہیں۔ایک بلڈنگ سے دوسری بلڈنگ کے درمیاں کافی فاصلہ ہوتا ہے۔اور درمیان میں بڑے بڑے گارڈن، پارک اور روڈ نظر آتی ہیں۔اور ہر بلڈنگ میں ایک بیڈ روم، دو بیڈروم، تین بیڈروم کے اپارٹمنٹ موجود ہوتے ہیں۔مزے کی بات ہر بلڈنگ کے باہر تقریباً پچاس، سو میٹر پر اس کا بورڈ لگا ہوتا ہے۔جس پر اس بلڈنگ کو بنانے، ارینج کرنے والی فرم کا نام درج ہوتا ہے۔بلڈنگ کے اندر کیا کیا سہولیات موجود ہیں۔اور سیفٹی کے لیے بلڈنگ میں ویڈیو کیمرہ کی اطلاع دی جاتی ہے۔اور اپارٹمنٹ خالی ہیں یا نہیں، وہ بھی اسی بورڈ پر درج ہوتا ہے۔واک کرتے کرتے مجھے اس طرح کے کئی بورڈ اور فرم کے نام اور ان پر درج انفارمیشن پڑھنے کو ملی۔اور مجھے اپارٹمنٹس مہیا کرتی کمپنیاں بھی سرِ عام ایک دوسرے کو مقابلہ دیتی لگیں۔۔

ان بلڈنگ میں گھروں کی لوکیشن ایک ہونے کے باوجود بھی ہر گھر کے مکیں مختلف ہیں۔ان کا طرز زندگی اور انداز فکر اور ہے۔ان کے مذاہب الگ ہیں، ان کی زبان فرق ہے۔اس کے باوجود جیسے وہ سب ایک ان دیکھی ڈور میں بندھے ہوئے ہیں۔ہر گھر میں اک علیحدہ جہاں بسا ہونے کے باوجود باہر وہ سب ایک اور ہی روپ میں ہوتے ہیں۔

آکاش کو تکتے موسم کی خوبصورتی کو محسوس کرتے ہوئے اگر وال ٹو وال گلاس ونڈو سے باہر دیکھیں

تو دوسری بلڈنگز کافی فاصلے پر نظر آتی ہیں۔ کسی کے گھر تانکا جھانکی ممکن ہی نہیں۔ لگتا ہے بلڈنگز کی بنیادیں رکھتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اس لیے اپارٹمنٹ کے مکینوں نے پردہ داری کا اہتمام اپنی پسند کے حساب سے کیا ہے۔ کسی گھر کلاسک سے پردے لگے نظر آتے ہیں۔ تو کسی گھر سادہ، کسی جگہ بلائنڈز۔۔۔ اور کسی جگہ پردے سرے سے موجود ہی نہیں۔ ممکن ہے بیچلرز اس چکر میں نہ ہی پڑتے ہوں، ورنہ کسی خاتون خانہ کے ہوتے ہوئے گھر میں اچھے سے کارٹن نہ لگے ہوں، یہ ذرا عجیب سی بات ہوگی۔ اس لیے کئی خواتین پاکستان سے کلاسک سے کارٹن اور فومی بیڈ کور تیار کروا کے لے آتی ہیں۔ ایک گھر میں ایک خاتون خانہ نے اپنے ڈرائنگ روم میں ایسے ہی لگے ہوئے پردے ہمیں دکھائے۔ اور ہم صرف ان کے اتنی دور سے سوٹ کیس میں مقید کر کے لانے پر داد دیتے رہے۔ بھئی یہ سب تو باہر ملکوں بہت اچھے سے مل جاتا ہے۔ مہنگا یا سستا، اس لیے لانے کا فائدہ؟ سو ایسے تردد میں ہم کم ہی پڑتے ہیں۔ ویسے بھی ہم جرمنی میں رہ کر جرمن سٹائل سے ہی گھر آراستہ کرنا زیادہ بہتر خیال کرتے ہیں۔ اس لیے نہ تو ملکوں ملکوں کی چیزیں لا کر گھر کو عجائب گھر کی طرح بنا دیا۔ اور نہ ہی جرمنی میں رہ کر گھر کو پاکستانی، انگلینڈ یا کینیڈا کے سٹائل کی طرح بنا دیا۔ بھئی اس طرح ہماری اپنی پہچان تو کسی طاق پہ پڑ جانی تھی نا۔ کیونکہ بہت سے لوگ ایسا ہی کرتے دیکھے گئے اور ہم مسکراتے ہی رہ جاتے ہیں۔ جیسے ٹی وی کے اوپر لوگ ڈیکوریشن پیس دھر دیتے۔ کوئی کلاک رکھ دینا، پھول سجا دینا، کوئی کینڈل لگا دینا۔ اور ہم سوچتے ہی رہ جاتے کہ ان چیزوں کو رکھنے کے لیے گھر میں اور بہت سی جگہیں موجود ہیں بھئی، تو اس بچارے ٹی وی پر یہ ستم کیوں؟

اور یہ پلاسٹک کے پھول تو جیسے ایشیائیوں کا سمبل بن کر رہ گئے ہیں۔ جس میں بلاتفریق پاکستانی، انڈین ایرانی، افغانی، بنگالی اور مختلف قومیتوں کے لوگ ہمیں نظر آئے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بنانے والوں نے

ان پر بھی بہت محنت کی۔ کسی کسی جگہ تو یہ اصل سے بھی خوب نظر آئے۔ گو یہ کبھی کبھی نظر کو خوب بہلا دیتے ہیں۔ لیکن خوشبو کا فقدان ہمیشہ باذوق لوگوں کو ان سے دور ہی رکھتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جرمنی میں رہ کر ہم اصلی پھولوں کے بہت قدردان ہو گئے ہیں۔۔۔
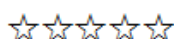
اپنا گھر

خیر تو بات یہاں لوگوں کی رہائش پر ہو رہی تھی۔ بڑی بڑی بلڈنگز میں اک دنیا سمائی ہوئی ہے۔ اور یہی ٹورنٹو کی نمایاں بات اور خوبصورتی مجھے لگی۔ انھی کے درمیاں چھوٹے چھوٹے گھر بھی نظر آتے ہیں۔ یقیناً بہت سے مکین ان میں ذاتی گھروں کے مالک ہوں گے اور بہت سے کرائے پر بھی ہوں گے۔ کیونکہ کئی جگہ یہ ایک جیسے بلاکس کی شکل میں نظر آتے تھے۔ ویسے ہائی بلڈنگ کی بالکونی سے یہ گھر بونے بونے سے نظر آتے رہے۔ اور اتنی بلندی سے ان میں اتنی خوبصورتی نمایاں نہیں ہوتی تھی۔ اور ایسے گھر ٹورنٹو میں بہت ہیں اور بکھرے ہوئے ہیں۔ روڈ پر کار میں جب ان کے پاس سے گزرتے تھے تو پھر یہ گھر بہت خوبصورت نظر آتے تھے۔۔

اور جوں جوں ٹورنٹو کے اردگرد کے نواحی علاقے اور شہر آتے ہیں یہ بلڈنگز کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور کالونی کی طرح علاقے شروع ہو جاتے ہیں۔ جن میں یا تو بلاکس کی طرح گھر تھے۔ یا پھر لوگوں کے اپنے اپنے ہاؤس تھے۔ جو لوگوں نے اپنی پسند سے بنوائے تھے۔ اور یہاں آ کر اصل اچیومنٹ بھی انھی لوگوں کی نظر آتی تھی۔ ایک روز میری اس ٹاپک پر میزبان سے بات ہوئی کہ ہمارے خیال سے جو لوگ یہاں شائد ابھی محنت، جدوجہد کے پیریڈ میں ہیں۔ وہ غالباً بلڈنگ کے اپارٹمنٹس میں رہنے کو ترجیح ہیں۔ اور بعد میں وہ اپنے ذاتی گھر خرید کر شہروں کے اردگرد نواحی علاقوں میں شفٹ ہو جاتے ہونگے، اس پوائنٹ پہ انھوں نے مجھے کافی انفارمیشن دی۔ انھوں نے کہا کسی حد تک بات صحیح ہے لیکن پھر بھی یہاں سب کو مختلف صورتحال پیش آتی ہے۔ زیادہ تر لوگ شروع میں آ کر یہاں اپارٹمنٹ میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور کچھ سالوں بعد اپنے آگے کے پلان سوچ لیتے ہیں۔ یہاں اپارٹمنٹس کی بھی قسمیں

ہیں ۔ایک نارمل اپارٹمنٹ ہوتے ہیں ، جوذرانسبتا سستے کرائے پرمل جاتے ہیں ۔اور بہت سے ہائی بلڈنگزاپارٹمنٹس ایسے ہیں ۔ جوکرائے پر بھی ملتے ہیں اورانھیں خریدابھی جاسکتا ہے۔انھیں ۔۔کنڈومینیئم اپارٹمنٹس ۔۔ کہتے ہیں۔جس میں سہولیات زندگی بھی زیادہ ہیں اورحفاظتی سسٹم ویڈیو کیمرے سے بھی بڑھ کرہے۔اورپھر بندہ چاہےتو بڑے آرام سےعلیحدہ اپنا گھر بھی خریدسکتا ہے۔

سو یہاں بہت سالوں سےسیٹل لوگوں اوررشتے داروں کے پاس اپنے بڑے بڑے ذاتی گھرہیں۔ اور یہ ان کی زندگی کا بڑا حاصل ہےاوراس پروہ بہت خوش اور مطمئن ہیں ۔ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ یہاں تک پہنچنے کے لیےزندگی میں انکی بھی بڑی جدوجہد شامل رہی ہے۔شروع میں سب کوہی سٹارٹ ایسے ہی لیناپڑتا ہے کہ اپارٹمنٹ میں رہے،اپنےاخراجات کوکنٹرول میں رکھےاورپھراپنےذاتی گھر کے لیےسیونگ کرے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اپنے گھر کا مالک بنتے ہی وہ فوراایک درجہ اوپر پہنچ جاتے ہیں ۔۔

یہ بات بھی سننے میں آئی کہ کافی لوگ یہاں ایسے بھی ہیں جوسستے اپارٹمنٹ میں رہ کرگزارا کرتے ہیں ۔اور یہاں اپنا گھر بنانا ہی نہیں چاہتے۔اپنا گھر وہ پاکستان میں خریدتے ہیں ۔اپنی زندگی کا حاصل وہ اپنے ملک میں بنانا اوردکھانا چاہتے ہیں ۔میزبان خاتون نے بتایا کہ ان کی ایک ایسی ملنے والی بھی ہے جویہاں عام سے اپارٹمنٹ میں دوتین سال رہتی ہے۔پھر پاکستان چلی جاتی ہے۔ بچے کی پیدائش ہونی ہوتو پھرمیاں بیوی یہاں آجاتے ہیں۔تھوڑے ماہ رہتے ہیں پھر پاکستان چلے جاتے ہیں ۔اوران کا سارا حاصل کردہ پاکستان میں ہے۔ بڑے بڑے ولا گھراورپجاروگاڑیاں وہاں انکے پاس ہیں۔اور یہاں وہ جتناعرصہ بھی رہیں،سادہ اورعام سی زندگی گزارتے ہیں ۔لیکن ہروقت اسکی باتوں میں فخر ہوتا ہے کہ ہمارے پاس پاکستان میں یہ بھی ہےوہ بھی ہے۔سو یہ دنیا ہےتو اس کے رنگ بھی نرالے ہیں ۔۔

ویسے میں نے اپنے طور محسوس کیا کہ یہاں اپنے گھروں میں رہنے والے لوگ بہت مطمئن اور خوش باش ہوں گے۔آسودہ حال بھی ہوتے ہوں گے۔لیکن بات وہی ہے کہ سب کو سب کچھ نہیں ملتا۔وہ مانیں یا نہ مانیں،اپنے ذاتی گھروں میں رہ کر انھیں بابی کیو کا خوب مزا آتا ہوگا۔پر ایک ہائی بلڈنگ سے نظر آتے خوبصورت،دلکش،پیارے سے مناظر ضرور اب ان کی پہنچ سے باہر ہو گئے ہیں۔وہ منظر جو شیشے کی وال ٹو وال ونڈو یا بالکونی سے ایک چائے کا کپ پیتے ہوئے نظر آئے،جس پر ایک پوری شام لٹائی جا سکتی ہے۔اور دور تک نظر آتی روشنیاں روز رات اک انوکھا منظر دکھاتی ہیں۔رات کی خاموشی جن پر اپنا سحر پھونکتی ہے۔اور جب بارش بوندیوں کی شکل برستی دکھائی پڑتی ہے،تو ایسا لگتا ہے جیسے موتیوں کی لڑیاں ٹوٹ کر زمین کی اور بکھرے چلی جا رہی ہوں۔۔

بارش کا خیال آتے ہی ہمیں وہ اشعار بے اختیار یاد آنے لگتے ہیں۔جو کبھی کبھی اک موسم کی طرح دل پر اتر آتے ہیں۔

ہم قرار کیا پاتے وحشتوں کے موسم میں
اس نے دور جانا تھا بارشوں کے موسم میں
بھیگی رتوں میں ہم بے سبب نہیں روتے
بارشیں تو ہوتی ہیں بارشوں کے موسم میں

☆☆☆

عیدالضحیٰ

اسے اتفاق کہہ لیجئے کہ اب ہم پکے پردیسی بن چکے ہیں۔ وطن کی عیداور اس کے فنکشن اب کم اور پردیس کی عیدیں ہم زیادہ بھگتاتے ہیں اور جرمنی، انگلینڈ اور کینیڈا میں یہ مواقع اب زیادہ ملنے لگے ہیں،ٹورنٹو جانے کے ایک ہفتے بعد ہی عیدالضحیٰ کا تہوار آ گیا۔کینیڈا میں دوسری بار عید منانے کا موقع مل رہا تھا۔پچھلی بار عیدالفطر منائی تھی اور اب کی بار عیدالضحیٰ منائی۔ جرمنی میں بھی عید اچھی گزرتی ہے لیکن پردیس میں عید منانے کا احساس حاوی رہتا ہے۔ جرمنی کی عید کے برعکس یہاں کے تہوار کافی مختلف ہیں۔۔شائد یہاں کے لوگوں کو اتنا پردیس میں ہونے کا احساس نہ ہی ہوتا ہو۔ کیونکہ وطن میں عید منانے کے لوازمات یہاں بآسانی محسوس ہورہے تھے۔ ویسے بھی جتنی زیادہ اپنی کمیونٹی ہوگی،لوگ ہوں گے،عید کی رونق بھی اتنی ہی دوبالا ہوجاتی ہے۔یہاں کی عورتوں کو سارادن کچن میں گھسنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور ہو بھی کیوں،آخر اس کی بھی تو عید ہوتی ہے بھئی۔ اور وہ سارادن کچن میں سر منہ جھاڑ حلیے میں کچن میں کام کرتی ہی نظر آئے بھلا یہ کس قانونی کتاب میں لکھا ہے یا اسلامی میں یا بہشتی زیور میں،کم سے کم باہر ملک رہنے سے مساواتی درجہ تو ملا ہے نا۔ پھر آج کی عورت اپنے مسائل سے بہتر طریقے سے نپٹنا بھی سیکھ گئی ہے اور باقیوں کے درمیان اپنی جگہ بنانا بھی،اور وقت کا پہیہ بھی اب گھوم چکا ہے۔یہاں عورتیں باقاعدہ تیار ہوکر عید کی نماز بھی پڑھ کر آتی ہیں۔ بلکہ پتہ چلا کہ ایک عید کے موقع پر اتنے مرد حضرات عید کی نماز پڑھنے کے لیے موجود نہیں تھے۔جتنی عورتیں موجود تھیں۔اور پھر عورتوں کے لیے دوبار نماز عیدادا کی گئی۔پچھلی بار عیدالفطر پر ہم صبح حلوہ پوری اور سویوں کا ناشتہ کر کے جو گھر سے نکلے تھے تو رات دس گیارہ بجے ہی واپس داخل ہوئے تھے۔ایک جگہ دوپہر کو دعوت تھی اور ایک جگہ شام کو،وہ

اٹینڈ کی اور پھر سینما میں اکٹھے کمار اور ودیا بالن کی عید کے موقع پر ریلیز ہندی فلم ۔۔بھول بھلیاں ۔۔ دیکھ کر ہی گھر واپسی ہوئی تھی ۔۔

عید کے روز لوگ خوب دعوتیں کرتے بھی ہیں اور دعوتیں کھاتے بھی ہیں ۔اس لیے کئی روز پہلے سے ہی عید کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ کسی کو دعوت دی جاتی ہے اور کسی کی دعوت قبول کی جاتی ہے۔اور پہلے سے ہی یہ طے کر لیا جاتا ہے کہ عید کے دن دعوتیں کھائی جائیں گی یا کھلائی جائیں گی۔عید کے تین دن یہ سلسلہ بخوبی چلتا رہتا ہے۔بس ایک بات کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے کہ دعوت کے لیے دیئے گئے وقت کی پابندی کرنی ہے، کیونکہ عین ممکن ہے کہ دعوت کھلانے کے بعد میزبان نے بھی آگے کسی جگہ مہمان بننا ہو۔آخر اس نے بھی تو وقت کی پابندی کرنی ہو گی نا۔اس لیے دعوت دیتے سمے خاص تاکید کی جاتی ہے کہ وقت پر پہنچ جایئے گا۔ یہ بات مجھے اچھی لگی کہ لوگ اب جذباتی رویوں سے باہر نکل رہے ہیں۔ورنہ پہلے کہہ دیا جاتا تھا کہ آپ کا اپنا گھر ہے، جب دل چاہے آ جایئے گا۔ چلو تھوڑا روکھا پن ہی سہی پر اب لوگ وقت کی اہمیت کو تو جان رہے ہیں۔ حالانکہ کسی کسی جگہ تو ابھی بھی اپنے روایتی انداز چل جاتے ہیں۔ جیسے اسی ٹور میں ایک جگہ دوسرے شہر ہم انوائیٹڈ تھے۔تو کچھ دیر سے نکلنے پھر ٹریفک کی بدولت پورا ایک گھنٹہ لیٹ ہو چکے تھے۔تو ہمارے ہمراہ ہمارے ساتھی ۔۔ میزبان سے معذرت خواہ ہو رہے تھے اور ہم ان سے بھی زیادہ سچے دل سے میزبان کو اپنے دیر سے پہنچنے کی وجہ وضاحت سے بتا رہے تھے۔ اور میزبان مسکراتے ہوئے کہہ رہے تھے کوئی بات نہیں ،کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔تو ہم نے بھی مسکرا کر ان کے کبھی کبھی کو آئندہ کے لیے پلے باندھ لیا۔ ورنہ کئی جگہ تو کئی لوگوں کو دوسروں سے یہ کہتے بھی سنا کہ آپ کا انتظار کر کر کے ہم نے کھانا شروع کر لیا۔ یہ سن کر ہم تو چونکنے ہو گئے اور سوچ لیا کہ بھئی اگر مہمان بننا ہے تو عزت سے بننا ہے۔۔۔

اس عیدالضحیٰ پر بھی دعوت نامے موجود تھے۔ سو پلان بنایا کہ پہلے کسے میزبانی کا شرف بخشنا ہے اور کسے بعد میں منانا ہے۔ یہاں پر یہ بڑی مشکل ہو جاتی ہے کہ اگر رشتے دار بھی قریب گردونواح میں مقیم ہیں تو ان کی دعوت کو خصوصاً ترجیح دینی پڑتی ہے، کیونکہ رشتے داری کا معاملہ آ جاتا ہے، ورنہ ناراضگی کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ گلے شکوؤں کے رویے ابھی باقی ہیں۔ سو عید کا دن بڑا خاص دن ہے تو اس دن عام ناشتہ تھوڑی کیا جاتا ہے۔ کچھ خاص اہتمام ہی ہوتا ہے۔ عید الفطر پر تو خاص الخاص میٹھی سویاں جو سارا سال آرام سے سویاں بنی رہتی ہیں شیر خرمہ بن جاتی ہیں۔ چھوارے، پستے، بادام کی نذر ہو جاتی ہیں۔ اب اسکے برعکس زردہ اور ان کے ساتھ مرغ چنے اور نان، انڈے اور پراٹھے گرم گرم چائے کے ساتھ کھائے گئے۔ اور تگڑا ناشتہ کرنے کو اس لیے ترجیح دی گئی کہ اس روز ایک ہی دعوت قبول کی گئی تھی۔ جس کا وقت کچھ عجیب سا تھا چار بجے، اب خود ہی سوچو بندہ اگر دوپہر والی دعوت ڈیڑھ دو بجے بھی قبول کر کے کھا لیتا تو چار بجے تو دعوت کھائی نہیں جانی تھی، صرف سونگھی جانی تھی۔ اور ہم اتنے بدذوق ہرگز نہ تھے کہ کسی کی بھرپور محنت سے انصاف نہ کرتے۔ اسی لیے ایک دعوت پر ہی اکتفا کیا گیا۔ کیونکہ دعوت کافی زوردار ہونی تھی۔ جسے پہلا کریڈٹ تو یہی جا رہا تھا کہ رشتے داروں میں ہو رہی تھی۔ دوسرا بہت سی فیملیاں جمع ہونے والی تھیں۔ تیسرے لفظوں میں جتنے لوگ اتنے ہی گوسپ بھی ہونے والے تھے۔ اور ہمارے کان یہاں کے گوسپ سننے کے بھی منتظر تھے۔ اور کھانا بھی زوردار ہی ہونا تھا۔ گوشت، مٹن، بیف ہی ہونا تھا۔ مرغی، فش کا نام و نشان بھی نہیں ہونا تھا۔ اس لیے طبیعت پہلے ہی ۔۔ گوشت، گوشت ۔۔ کی ڈشز کے لیے تیار کی جا رہی تھی۔ اور ناشتہ زوردار اس لیے کہ کہیں تب تک فاقے کی نذر نہ ہو جائیں۔ وقت کی پابندی کی یاددہانی یہاں بھی برقرار تھی۔۔

☆☆☆☆☆

عید پارٹی

خاص دعوت کے لیے خاص تیاری کی بھی ضرورت تھی۔ سو دو بجے ہی اٹھ کر تیار ہونا شروع کر دیا۔
سادہ حسن تو وافر موجود تھا لیکن آج کا دن کوئی عام دن تھوڑی تھا، اک مقابلے کا دن تھا۔ اور ہم کسی سے کم نہیں کے مصداق تیار ہونا لازم تھا۔ نہ جانے وہاں کتنی حسیناؤں نے موجود ہونا تھا اور کتنی خواتین نے ٹکر دینا تھی۔ اپنے کپڑوں اور جیولری کو کو دنیا کے سامنے لانا تھا۔ انھیں ہوا لگوانی تھی۔ ادھر ہم بھی کسی سے کم نہیں رہنا چاہتے تھے۔ اس لیے بیوٹی پارلر کا چکر تو ہم پہلے ہی جرمنی سے آتے ہوئے لگا کر آئے تھے۔ اور اب عید سے پہلے بھی یہاں کے بیوٹی پارلر سے اپنی آنکھوں کی کمانیاں چیک کروا چکے تھے۔ عید کا جوڑا اور کچھ فنکشن سوٹ تو جرمنی سے لے کر پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ میک اپ کا ساز و سامان بھی نیا نکور یہاں سے خریدا جا چکا تھا۔ پرفیوم کی چھچماتی شیشی کو بھی دو چار بار گھما کر دیکھ چکے تھے۔ سوٹ کے حساب سے جیولری، شیایان شان بیگ اور خوبصورت سے جوتے بھی موجود تھے۔ سو دیر کس بات کی تھی، اٹھ کر تیار ہونے لگے۔ اور تیاری کرنے میں ہم ماہر ہیں۔ کیونکہ کئی دلہنیں بھی تیار کر چکے ہیں۔ تو پھر اپنے آپ کو سنوارنا، نکھارنا کونسا مشکل کام تھا۔ سی گرین، تھوڑا فیروزی شیڈ دیتا ہوا رنگ ہمارے عید کے جوڑے کا تھا۔ جسے آج پہلی بار پہننا تھا۔ بھرپور دھیان اور دل لگا کر تیار ہوئے اور اپنے آپ کو دیکھنے کے لیے قد آدم آئینے کے روبرو جا کھڑے ہوئے۔ اس میں خود کو دیکھ کر کتنا اچھا لگ رہا تھا، اور جب دل سے اس بارے رائے لینا چاہی تو وہ کچھ یوں کہہ رہا تھا،

مقابلہ ہم سے نہ کرو مقابلہ ہم سے نہ کرو ہم تمھیں
اپنے رنگ میں رنگ ڈالیں گے ایک ہی پل میں

اوہو۔۔ یہ تو کسی مقابلے کی بات کر رہا ہے۔ ہم گھبرا کر آئینے کے سامنے سے ہٹ گئے۔ ہم تو یہاں سیر یں کرنے آئے ہیں۔ یہاں کی آب و ہوا اور دانہ پانی چیک کرنے آئے ہیں۔ کوئی مقابلہ کرنے تھوڑی آئے ہیں۔۔

وقت مقررہ پر ہم تقریب میں جا پہنچے تو محفل جواں ہونے جا رہی تھی۔ گویا ہمارا ہی انتظار ہو رہا تھا۔ آدھے سے زیادہ مہمان آ چکے تھے۔ کچھ آنے والے تھے۔ بچوں کے زرق برق لباس دیکھ کر اچھا لگ رہا تھا۔ عید کے ہونے کا احساس جاگ اٹھا تھا۔ کسی بھی شادی یا عید کے موقع پر ہم پہلے بچوں کے کپڑے دیکھ کر اندازا لگا لیتے ہیں کہ ماؤں نے کتنا دل لگا کر بچوں کو تیار کیا ہے۔ یا صرف اپنی تیاری پر ہی زور لگا دیا ہے۔ سو دیگ کا دانہ چیک کرنے بمصداق ہم نے بچوں کے کپڑوں پر پہلے نگاہ کی۔ چھوٹے لڑکوں کے لباس میں تو خاص ورائٹی نہیں ہوتی۔ نارمل سے کپڑے پہن کر بالوں میں جیل لگا کر بال کھڑے کر کے وہ سمجھتے ہیں کہ بس تیاری پکڑ لی۔ البتہ چھوٹی بچیوں نے خوب پیارے پیارے لباس پہنے تھے۔ بلکہ ایک گوری کی صحتمند بچی نے لہنگا پہنا ہوا تھا اور اپنے پٹ سن جیسے لمبے بال کھول رکھے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے بالوں کو چہرے سے پیچھے کرنے کے لیے وہ اک خاص انداز سے انھیں جھٹکا بھی دیتی اور ہم اسکے جھٹکے دیکھتے رہے۔ کافی مینرز والی فرینڈ لی بچی تھی۔ وہ ہماری توجہ کا مرکز بنی رہی۔ اس نے آ کر سب سے ہاتھ ملایا اور ہلو ہائے کی۔ تب مجھے اسکی ماں کی تلاش میں نظریں دوڑانا پڑیں۔ دیکھا تو اس کی گوری ماں بھی پاکستانی لباس میں ملبوس تھی۔ پر بیٹی کے الٹ ذرا خاموش مزاج کی تھی۔ وہ چپ چاپ ایک جگہ بیٹھی رہی۔ کوئی انگلش سپیکنگ اس سے بات کر لیتا تو اس کے چہرے پر بھی رونق آ جاتی۔ تھوری دیر کو وہ بھی اس ماحول کا حصہ لگتی، ورنہ وہ ہوتی اور اس کی ساتھی خاموشی، اس وقت

مجھے دل میں شدت سے یہ احساس ہوا کہ جس طرح ہم پردیس میں پردیسی بنے رہتے ہیں۔کبھی کبھی اجنبی سے لگتے ہیں۔اپنی پہچان ڈھونڈ تے ہیں۔بالکل اسی طرح ایسا ہی ان کے ساتھ بھی ہوتا ہے، جب وہ ہم ایشیائیوں کے درمیاں ہوتے ہیں۔۔

قرب وجوار سے مہمان جمع ہوئے۔مڈل ایج عورتوں نے سٹائلش خوبصورت لباس پہن رکھے تھے، جیولری پر بھی کافی دھیان دیا گیا تھا۔لیکن نوعمر لڑکیوں اور جولڑکیاں جاب کرتی ہیں۔وہ اور طرح سے تیار ہوئی تھیں۔ٹراؤزر انھوں نے لازمی پہنی تھی پھر باقی فیشن اپنانے کی کوشش کی تھی۔اور جیولری بھی بہت کم پہنی تھی۔گولڈ ان کے پہنا ہوا کم ہی نظر آیا۔البتہ انگلیوں میں کافی رنگز نظر آئیں،ایک ہلکی چین اور کلائی میں ایک بریسلٹ ان کی زینت بنا تھا۔میک اپ سے عاری اور وہ اتنے میں ہی پر اعتماد نظر آتی تھیں اور ان کے چہروں پر اک سکون کی کیفیت تھی۔نہ کوئی مقابلے کی کیفیت تھی اور نہ ہی باقی ماحول انھیں ٹکر دے رہا تھا۔جبکہ باقی عورتیں خوب بھاری بھر کم لباس، مہنگی جیولری اور بھاری میک اپ میں نظر آ رہی تھیں۔پر عید کا پر مسرت موقع تھا، رونق تھی، خوشی تھی۔ایسے میں ہر طرف رنگوں کی ایک بہار سی محسوس ہو رہی تھی۔۔

میری وہاں پر بہت سی خواتین سے ملاقات ہوئی۔میں نے نوٹ کیا کہ ان کی گفتگو کا زیادہ مدعا جیولری اور اسٹائلش ڈریس ہوتے کہ کونسی بوتیک سے لیا اور کتنے کا لیا؟ کینیڈا میں کپڑوں کی کافی پاکستانی اور انڈین دوکانیں ہونے کے باوجود خواتین ان اہم موقعوں عید اور شادی، فنکشن کے لیے کپڑے پاکستان سے ہی لیتی ہیں یا تیار کرواتی ہیں۔کسی کے کپڑے پارسل میں یا کسی آنے والے دوست احباب کے ذریعے آتے ہیں یا آن لائن بوتیک سے آرڈر کر لیے جاتے ہیں۔حالانکہ اس طرح وہ کافی مہنگے پڑتے ہیں۔لیکن پھر بھی بہت سے لوگ یہی طریقہ اپناتے ہیں۔بقول ان کے اور کوئی چارہ نہیں۔وہاں

ہم نے لوگوں کے پاس ہزاروں کی مالیت کے ڈریس بھی دیکھے، لیکن کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ اتنا مہنگا لینے کی کیا ضرورت تھی بلکہ فوراً وہ ڈریس اور بوتیک نوٹ کر لی جاتی تھی۔ پہلے سادگی کے طریقے اپنانے کو گھر کے بڑے اور بزرگ ہی فوراً کہتے تھے اور فضول خرچی پر ٹوک دیتے تھے۔ اور اب میرے سامنے اک نیا ماحول تھا۔ نصیحت کرنے والے خود اس چکاچوند ماحول کا حصہ بنے بیٹھے تھے۔ اور۔۔۔ لڑکیاں سادگی کا نمونہ بنی ہوئی تھیں۔۔

عجب ہے داستاں تری اے زندگی
کبھی ہنسا دیا رلا دیا کبھی عجب ہے داستاں

عید کے کھانے

کھانا بالکل تیار تھا۔ چند خواتین نے مل کر اچھا خاصا کھانا تیار کر لیا تھا۔ مرد حضرات کھانا لے چکے تھے۔ سو میزبان نے خواتین کو کھانا شروع کر دینے کا اعلان کیا۔ تو سب کچن میں کھانے کی میز کی طرف چل دیں۔ حسب توقع گوشت کی بہت سی ڈشز نظر آ رہی تھیں۔ لیکن اللہ کا شکر میزبان نے مینو بڑا سوچ سمجھ کر بنایا تھا۔ مٹن کڑاہی، پسندے، شاہی قورمہ، گرل کباب، سیخ کباب، شامی کباب، ریشمی کباب، کلیجی، حلیم، بیک سبزیاں، نان، سلاد، رائتہ اور بعد میں سویٹ ڈش میں کھیر اور کئی طرح کے کیک موجود تھے۔ سب نے اپنی اپنی پلیٹیں تیار کیں اور جہاں جگہ ملی۔ بیٹھ کر کھانا مزے سے کھایا۔ اور لوگ دوسری تیسری بار جا کر بھی کھانے کے لوازمات لاتے رہے۔۔

کھانے سے پہلے تو خواتین زیادہ فارمل ہی رہیں، باتیں بھی ناپ تول کر کیں۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کے کپڑے، جیولری جذب کرتی رہیں۔ پر کھانے کے بعد ماحول کافی بے تکلف سا ہو گیا۔ پیٹ بھی بھر گیا اور کھانے سے فراغت بھی پا لی تو اب گرم گرم چائے پیتے میٹھی ڈش کھاتے ہوئے

آرام سے باتوں کا دور چلنے لگا۔اب وہ اس ماحول کا مکمل حصہ بن چکی تھیں۔میرے لیے کچھ خواتین جانی پہچانی تھیں اور بہت سی انجان تھیں۔اور مجھ سے پہلے میرا ذکر یہاں پہنچ چکا تھا کہ میں ان کی ایک ادبی مہمان ہوں۔جو آن لائن اخبار،میگزین میں لکھتی ہوں۔میری ایک ای بک۔۔چاند اور صحرا۔۔آ چکی ہے۔دو کتابیں چھپنے کے لیے بالکل تیار ہیں۔مہربانوں کے پاس سب رپورٹ صحیح تھی۔ہم نے اپنی ساتھی میزبان کو دیکھنا چاہا تو وہ اپنے قرب و جوار میں نظر نہیں آئی۔آنکھیں پٹپٹا کر دیکھا تو وہ دور کسی جاب کرنے والی لڑکی کے پاس بیٹھی نظر آئیں۔میں کسمسا کر رہ گئی۔گو وہ دور بیٹھی تھیں۔لیکن ان کے قہقہے یہاں تک پہنچ رہے تھے۔ہمارے دل میں پھلجڑی چھوٹی کہ واقعی قہقہے لگانے میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔۔

اب خواتین ہم سے باتیں کرنا شروع ہوگئیں۔ان کے دوموضوعات کا سلسلہ اب ہم سے جڑنے لگا تھا۔کچھ مہربان ہم سے جرمنی اور یورپ کے بارے میں بات کرنا چاہ رہی تھیں۔انھیں بھی یورپ دیکھنے کا اشتیاق ہورہا تھا۔ویسے ہم جہاں بھی جاتے۔وہاں کے لوگ یہ سوال ضرور پوچھتے کہ آپ کو کینیڈا کیسا لگا؟اپنی طرف سے وہ ایک طرح سے ہمیں گھیرنے کی کوشش کرتے۔لیکن ہم بھی کائیاں تھے۔گورداس مان کا وہ گیت کئی بار سن رکھا تھا۔

لکھ پردیسی ہوئیے اپنا دیس نیئں بھنڈی دا

جیہڑے ملک دا کھائیے اوہدا برا نئیں منگی دا

سو بات کو بل دے کر نکل جاتے۔کیونکہ دل کا حال کسی کو نہیں بتا سکتے تھے۔حقیقت میں تو ہم پردیسی تھے، دل میں وطن کی یادیں تھیں۔لیکن اب جرمنی میں تھے تو دن رات وہیں کے تھے۔ان بہاروں اور

فضاؤں سے مانوسیت ہو چلی تھی۔ گو ہٹلر کے دیس میں تھے لیکن اب مانوس صیاد ہو چکے تھے۔ اور وہیں سے سرما کا چانداور چودھویں کا چاند دیکھتے تھے۔ اور انھیں تکتے تکتے وہ موسم دل پر وارد ہونے لگے تھے جسے آمد سے تشبیہ دی جاتی ہے۔۔

پھر کچھ خواتین ہمارے لکھنے بارے پوچھ رہی تھیں۔ اتنے میں ایک خاتون جو انڈیا سے تعلق رکھتی تھیں، ہمارے بارے میں جان کر جذباتی ہو کر بالکل ساتھ آ کر بیٹھ گئیں۔ اور کہنے لگیں،

:مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ میرے شوہر بھی بڑے ادبی قسم کے انسان ہیں۔ میں انھیں آپ کے بارے میں بتاؤں گی تو وہ بھی بڑے خوش ہوں گے، ٹھہریئے، میں انھیں آپ سے ملواتی ہوں۔:

یہ کہہ کر وہ اٹھ کر چل دیں اور جا کر مردانے میں جھانکنے لگیں۔ میں ان کی بات سن کر جز بزسی ہوئی۔ اور اپنی جگہ پر پہلو بدل کر رہ گئی۔ یہاں مرد حضرات علیحدہ بیٹھے تھے اور عورتیں علیحدہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ فنکشن میں رشتے دار تو تھے ہی، کافی دوست احباب بھی تھے۔ اس لیے میزبان نے مخلوط کی بجائے مردوں اور عورتوں کے لیے علیحدہ انتظام کیا ہوا تھا۔ اور کسی بھی فنکشن کے لیے یہ میزبان کی ہی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ سب کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے کیسے انتظامیہ کا کردار ادا کرے۔ سوئے اتفاق، ان کے کئی بار جا کر جھانکنے پر بھی ان کے شوہر برآمد نہ ہو سکے۔ اور تب تک میں دل میں کئی بار ان خاتون کو کہہ چکی تھی: کہ آپ ہم سے مل لیں یہی کافی ہے۔ اپنے شوہر نامدار کو رہنے دیجیو، پھر بھی آپکی تسلی نہیں ہو رہی تو اپنے شوہر کو ہمارا سلام دے دیجیو، پر اب واپس آ کے اپنی جگہ پر بیٹھ جائیو۔:

شائد ہمارا پیغام ان تک پہنچ گیا تھا۔ تبھی وہ چپ چاپ سی واپس آ کر بیٹھ گئیں۔ بار بار کہتیں،

:وہ پتہ نہیں کدھر چلے گئے۔ دیکھنا اب جب میں انھیں بتاؤں گی تو انھیں آپ سے نہ ملنے کا بہت افسوس

ہوگا۔:

اس بات پر میرے دل میں اک پھلجڑی چھوٹی۔

اب باقیوں کی سننے کے ساتھ ساتھ میں نے بھی ان سے سوالات کرنے شروع کر دیئے تھے۔ کہ اخبارات اور میگزین کے ذریعے پتہ چلتا رہتا ہے کہ کینیڈا میں کافی فنکار، اداکار، مصنف، شاعر اور فلموں سے متعلق لوگ یہاں رہتے ہیں۔ اور ان کی ایک بڑی تعداد ٹورنٹو میں بھی ہوتی ہے۔ کیا کبھی ایسے لوگوں کو اپنے درمیاں محسوس کیا۔؟ تب انھوں نے بتایا کہ یہاں پر انڈیا، پاکستان سے بہت سے مختلف شعبوں سے وابستہ لوگ ہیں۔ شوبز والے بھی آتے ہیں، ہر سال اگست میں کافی تقریبات ہوتی ہیں۔ بہت سے کنسرٹ ہوتے ہیں۔ تب گروپ کی شکل میں ہمارے ملکوں سے فنکار یہاں آ کر اپنا فن پیش کرتے ہیں۔ اور شائقین کے لیے خوب رونق لگی رہتی ہے۔

تب ایک نے فخر یہ بتایا کہ اس نے ایک کنسرٹ میں مشہور انڈین گائیک۔۔ مناڈے۔۔ کو سنا اور اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اوپن ائر پروگرام میں اپنے روبرو مناڈے کو گاتے دیکھ رہی ہے۔ وہ جیسا ٹی وی پر نظر آتا ہے بالکل ویسا ہی سامنے بھی پایا۔ ایک نے بتایا کہ اس نے ائیر پورٹ پر پاکستانی کرکٹر وسیم اکرم کو دیکھا تھا۔ فنکار لوگ رہتے یہاں ضرور ہیں لیکن عام کبھی نظر نہیں آئے۔ لیکن انھوں نے دلچسپ انفارمیشن دی کہ ٹورنٹو سے باہر ایک جگہ ہے جسے امراء کا علاقہ کہا جا سکتا ہے۔ وہاں امیر لوگوں کے گھر ہیں۔ بالکل ہائی سوسائٹی کے لوگ سمجھ لیں۔ اس لیے انھیں لگتا ہے کہ فنکار لوگ بھی زیادہ وہیں ہوں گے۔ تب فوراً دوسری نے کہا کہ اس کا خیال نہیں کہ وہ لوگ وہاں رہتے ہوں گے۔ کیونکہ اس علاقے میں تو وہ عورتیں اپنے بچوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ جن کے شوہر حضرات دوسرے ملکوں خصوصاً سعودی عرب

دبئ ، مڈل ایسٹ میں نوکری کرتے ہیں اور صرف چھٹیوں میں یہاں آتے ہیں۔لیکن گھر بار، بیوی بچے سب انھوں نے یہاں سیٹ کیے ہوئے ہیں۔

:بیگم پورہ۔۔نام کتنا چن کرر کھا ہے۔: دوسری بولی

اس پر سب قہقہہ مار کر ہنس پڑیں۔

یوں عید کا پہلا دن بہت اچھا گزرا۔عید کی تقریبات اور مصروفیت ختم ہوتے ہی کار ہائے زندگی اک بار پھر معمول پر آ گئے۔اور عید کے بعد اک بار پھر دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔اب رشتے داروں کے علاوہ دوست احباب کی جانب سے بھی دعوت نامے ملنے شروع ہوگئے۔یوں ملاقات کا سلسلہ بڑھنے لگا۔۔

شوق اور شائقین

کینیڈا کے بڑے گھروں میں بڑے بڑے کچن میں خواتین کی بے تکلف گیدرنگ ہوتی ہے، دوسرے لفظوں میں کٹی پارٹی کہہ لیں۔ باتوں کے ساتھ ساتھ کھانا پینا، چائے کافی بھی چلتی رہتی ہے۔ بڑی سکرین کے ٹی وی کچن میں موجود ہیں۔ اگر کچن درمیانہ سائز کا ہے تو ایک کونے میں صوفہ اور کافی ٹیبل رکھ لی جاتی ہے اور کچن میں ہی طعام کے ساتھ بیٹھنے باتیں کرنے کا سلسلہ کرلیا جاتا ہے۔ اور اگر کچن کافی بڑا ہے تو اس کا آدھا حصہ ٹی وی لاؤنج بنالیا جاتا ہے۔ اس طرح انھیں گھر میں دعوت وغیرہ کے مواقع پر بھی آسانی رہتی ہے۔ اگر مخلوط انتظام نہ کرنا ہو تو تب بھی یہ کچن ہی خواتین کے کام آجاتا ہے۔

خواتین جب مل بیٹھتیں تو ڈراموں کا ذکر بڑے شوق سے کرتیں۔ اور ایک دوسری کو بتاتیں کہ میں آجکل یہ ڈرامے دیکھ رہی ہوں۔ میں نے تقریبا ہر گھر میں۔۔ جیو ٹی وی۔۔ ہم ٹی وی۔۔ اے آر وائی چینل اور کچھ انڈین ٹی وی چینل دیکھے۔ منفرد بات یہ لگی کہ اب سٹار پلس کا تذکرہ پیچھے جاچکا۔ اس کا ذکر کوئی نہیں کررہا تھا۔ جبکہ میں امید کررہی تھی کہ شائد کوئی میری ہم ذوق نکل ہی آئے اور سونی ٹی وی کے ڈرامہ۔۔ بڑے اچھے لگتے ہیں۔۔ کے بارے میں کوئی کمنٹ دے کہ وہ دیکھا جارہا ہے۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ ہم سفر ڈرامہ یہاں کافی ان ہے۔ ہر کوئی اسی کے بارے میں بات کرتا ہے۔ مجھ سے بھی بارہا پوچھا گیا کہ میں یہ ڈرامہ دیکھتی ہوں۔ تو میرے انکار پر وہ حیران ہوتیں۔ پھر مجھے انہیں بتانا پڑتا کہ میں نے یہ ناول پڑھ لیا ہے، اس لیے اب ڈرامہ دیکھنے کا کیا فائدہ؟

تب ان میں سے بیشتر ڈرامے کی کہانی بارے جاننا چاہتیں۔

ایک کہتی: یہ خرد خاموش کیوں رہتی ہے۔ بولتی کیوں نہیں، جواب کیوں نہیں دیتی ؟:

تب دوسری کہتی: لگتا ہے ڈرامہ کافی لمبا چلے گا۔ اور اگلی نسل تک پہنچ جائے گا۔ دیکھ لینا یہ اشعر اور خرد بوڑھے ہو جائیں گے اور کہانی اگلی نسل میں بھی چلے گی۔:

اور میرے دل میں پھلجڑی پھوٹتی کہ اس طرح خیالات دوڑانے سے بہتر تھا کہ ناول ہی پڑھ لیتیں۔

اچھی بات یہ ہے کہ اب سٹار پلس کی جگہ۔۔ ہم ٹی وی۔۔ خواتین کی پسندیدہ فہرست میں ہے۔ سو ہم نے دیکھا کہ یہاں دل کی خوشی حاصل کرنے کے لیے۔۔۔

کچھ لوگ تیں، چالیس اور پچاس ہزار کے ڈریس بنانے میں پائے گئے۔۔

کچھ خواتین مہنگی جیولری اپنے پاس جمع کرتی دیکھی گئیں۔۔

بہت سی خواتین مارننگ شوز اور ڈرامے شوق سے دیکھتی پائی گئیں۔۔

مرد حضرات۔۔ بگ بی۔۔ دیکھنے میں مصروف پائے گئے۔۔

کافی لوگ کمپیوٹر، انٹرنیٹ میں یوٹیوب اور فیس بک کے شائقین پائے گئے۔۔

ادبی قسم کے خواتین و حضرات کا تناسب کم رہا۔۔

گھومنے پھرنے کے شوقین لوگ ہر جگہ پائے گئے لیکن ایکسر سائز اور سیر کے لیے انکے پاس وقت نہیں۔

سو ہم نے دیکھا کہ لوگ دل کی خوشی حاصل کرنے کے لیے کتنے جتن کرتے ہیں، ہزاروں، لاکھوں بھی بخوشی لگا دیتے ہیں، جبکہ خوشی تو بعض دفعہ نو سو، ہزار روپے کی کتاب پڑھ کر بھی مل جاتی ہے۔۔۔

☆☆☆☆☆

تاریخی نظر

کسی ملک کی تاریخ جاننا بھی ایک دلچسپ کام ہے۔ سو یہاں مختصر سی نظر اس کی ہسٹری پر بھی ڈال لی جائے۔ اگر ویسے کینیڈا کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو کینیڈا رقبے کے لحاظ سے دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے۔ یہ براعظم شمالی امریکہ کے بڑے حصے پر محیط ہے۔ بحر اوقیانوس سے لے کر بحر منجمد شمالی تک پھیلا ہوا ہے۔ کینیڈا کی سرحدیں امریکہ کے ساتھ جنوب اور شمال مغرب کی طرف سے ملتی ہیں۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے کرنسی کے حوالے سے بتایا تھا کہ دو ڈالر کے سکے پر ملکہ الزبتھ کی فوٹو ہے تو پہلے کینیڈا، برطانیہ کے زیر اثر تھا۔ اور کینیڈا نے برطانیہ سے بتدریج آزادی حاصل کی تھی۔ اور یہ عمل آہستہ آہستہ ہوا تھا۔

اس کی تاریخ کے مطابق ساڑھے نو ہزار سال پہلے اس خطے میں انسانی آبادی کے آثار ملے۔ تو یورپی اقوام پہلی بار یہاں آئیں۔ جن میں برطانوی اور فرانسیسی قوم شامل تھیں اور یہاں انھوں نے اپنی علیحدہ علیحدہ بستی بسائی۔ اور سترہویں صدی کا بیشتر حصہ انھوں نے ایک دوسرے سے الگ تھلگ اپنی اپنی کالونیوں میں گزارا۔ اس کے بعد برطانوی، فرانسیسی اور ساحلی قبائل میں جنگیں چھڑنے لگیں۔ اور یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ کینیڈا برطانیہ کے زیر اثر ہی رہا اور پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ کی شمولیت کی وجہ سے کینیڈا بھی خود بخود جنگ میں شریک ہو گیا۔ اور دوسری جنگ عظیم کے دوران کینیڈا کی معیشت نے بہت تیزی سے ترقی کی۔ جس کی بڑی وجہ جنگی ہتھیاروں کی تیاری تھی۔ اور کینیڈا کے سو سال مکمل ہونے کے بعد یورپی ممالک سے وہاں امیگریشن کا تانتا بندھ گیا۔ سترہ اپریل انیس سو بیاسی کو کینیڈا نے ملکہ الزبتھ دوم کی منظوری سے اپنے آئین کو برطانوی آئین سے علیحدہ کر لیا۔ اور اپنے آپ کو ایک آزاد مملکت کا درجہ دے دیا۔ اگرچہ دونوں ممالک ابھی بھی مشترکہ علامتی بادشاہت کے ماتحت تھے۔۔

اسی لیے انگریزی اور فرانسیسی کینیڈا کی دو سرکاری زبانیں ہیں۔ کینیڈا میں دس صوبے اور تین ریاستیں ہیں۔ ٹورنٹو، اونٹاریو کے صوبے میں ہے۔ کینیڈا میں اس وقت ملکہ الزبتھ کے ساتھ آئینی بادشاہت کا نظام قائم ہے اور وفاقی طرز کی پارلیمانی جمہوریت کا نظام بھی ہے۔ کینیڈا کے امریکہ سے بہت گہرے تعلقات ہیں۔ اور اسے اپنے عالمگیری نظام اور ڈھیروں قومیتوں کی وجہ سے ایک ثقافتی ملک ہونے پر ناز ہے۔ اور یہ بھی کہ کینیڈا دنیا کے امیر ملکوں میں شامل ہے۔

پچھلی بار جب کینیڈا آنا ہوا تو جولائی کا مہینہ تھا۔ خوب گرمی کے مہینے تھے۔ تقریباً ہر جگہ، گھروں میں اے سی لگے تھے۔ کیونکہ کینیڈا کا موسم کافی شدت رکھنے والا ہے۔ گرمیوں میں خوب گرمی اور سردیوں میں سردی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور سننے میں آیا ہے کہ کینیڈا میں جتنی جھیلیں اور دریا ہیں، اتنے دنیا میں کسی اور ملک میں نہیں ہیں۔ کینیڈا کے ایک صوبے میں اتنی سردی اور برفباری کی شدت ہوتی ہے کہ یہاں رہنے والے لوگ بھی توبہ توبہ کرتے ہیں۔ اور اس صوبے میں چونکہ آبادی اور معیشت نہیں تو حکومت لوگوں کو وہاں بسانے کے لیے آئے دن پرکشش آفرز اور پیکجز دیتی ہے۔ دانہ ڈال کر پھر اوپر جال پھینک دیتی ہے۔ جیسے حکومت نے اک نئے قانون کی مد میں آفر دی کہ جو لوگ وہاں جا کر سیٹل ہوں گے۔ وہ اپنے ایک عزیز رشتے دار کو اپنے ملکوں سے بلا کر سیٹ کر سکتے ہیں۔ میں وہیں تھی جب لوگوں کا اس پر ردعمل دیکھا۔ کہ نہ نہ بھئی، اتنی ٹھنڈ میں وہاں رہنا ناممکن ہے۔ البتہ کچھ لوگ تھے جنہوں نے اس کا فائدہ اٹھایا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس شرط کو پورا کرنے کے لیے وہاں اپنا گھر خریدنا لازم ہے۔

تب جولائی کے مہینے میں دن خوب بڑے اور روشن تھے۔ دن میں خوب ٹکا کے گرمی پڑتی۔

اور یہ چیز میں نے وہیں جا کے دیکھی اور محسوس کی کہ وہاں کی نیوز میں موسم کا حال بتاتے ہوئے کہا

جاتا کہ آج اتنے ڈگری درجہ حرارت ہوگا،ٹمپریچر اتنا ہوگا لیکن محسوس اتنا ہوگا۔یعنی اگر درجہ حرارت تیس ڈگری ہے،لیکن محسوس ہوگا کہ وہ چھتیس ڈگری ہے۔شروع میں ہم اس بات پر کافی پریشان بھی ہوئے کہ یہ کیا،ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور ۔۔یا ایسا لگتا یہ خود ہی بے اعتباری میں ہیں ۔اس لیے یا یہ یا وہ،والا معاملہ ہے۔کیونکہ ایسا تو یورپ،ایشیا میں بھی نہ دیکھا تھا۔۔

اونٹاریو سائنس سینٹر

یہ ایک سائنس سینٹر ہے۔ اسے اونٹاریو سائنس سینٹر کہتے ہے۔ یہ ایک بہت خوبصورت عمارت ہے۔ جو آس پاس کی ہائی بلڈنگز میں گھری ہوئی ہے لیکن اس کی اپنی ایک شان ہے۔ کہتے ہیں کینیڈا کا سو سالہ جشن آزادی مناتے ہوئے حکومت کی طرف سے اپنی عوام کے لیے یہ ایک خاص الخاص تحفہ تھی۔ اس کے اندر تجربہ گاہیں اور جدید ترین سائنسی آلات موجود ہیں۔ اسے عوام کو دیتے ہوئے حکومت کا یہ نظریہ تھا کہ اگر یہاں سے ایک بچہ بھی فائدہ اٹھا کے نکلا تو وہ اپنی اس کوشش کو کامیاب سمجھیں گے۔ یہاں پر ہر وقت بچوں اور ان کے ساتھ بڑوں کا بھی رش لگا رہتا ہے۔ روزانہ دور دراز سے بسیں بھر کر یہاں آتی ہم خود دیکھتے تھے۔ اس کی عمارت باہر سے بھی بہت ہی خوبصورت ہے۔ جس کے ایک طرف بڑے بڑے پانی کے بے شمار فوارے لگے ہیں۔ گرمی کی شدت میں ان کا نظارہ کرنا، ان کے قریب جانا اور وہاں بیٹھنا کافی اچھا لگتا تھا۔ روزانہ شام کے بعد کا زیادہ وقت ہم وہیں گزارا کرتے تھے۔ اور بھی کافی لوگ وہاں آتے تھے۔ بلکہ حکومت کو اندازہ بھی نہیں ہوگا کہ یہ اب سائنس سینٹر کے علاوہ ایک اچھی خاصی تفریح گاہ بھی بن چکا ہے۔ عمارت کے سامنے ایسے فوارے لگے تھے۔ جیسے کسی بانسری سے پانی کی لہریں باہر آ رہی ہوں۔ اور جب بچے اور بڑے بھی جا کر اس بانسری کو بجانے کی کوشش کرتے تو اتنی خوبصورت موسیقی بجتی کہ اگر ہم سب منہ دوسری طرف کیے کسی سے باتوں میں بھی مصروف ہوتے تو سب لاشعوری طور پر مڑ کر دیکھنے لگتے۔ اور مزے کی بات کہ ہر ایک کے بجانے اور موسیقی کے سر نکلنے سے کسی کے ماہر اور مشاق ہونے کا پتہ لگتا۔ ہمیں تو یہ بہت پسند آئی۔۔

☆☆☆☆☆

بلفر پارک

ٹورنٹو میں بڑی بڑی جھیلیں ہیں۔ پارک ہیں۔ گارڈن ہیں۔ اور قدم قدم پر فطرت کے نظارے ہیں۔ انھی میں ایک بلفر پارک کے نام سے مشہور ہے۔ جہاں جا کر ایک وقت میں بیچ، نیچر، پانی، اور پہاڑیاں سی ہم نے دیکھیں۔ اور گرمی میں ہی یہ جگہ رونق دیتی ہے۔ تب جولائی کا مہینہ تھا۔ گرمی شدت پر تھی، ویک اینڈ پر ایک دن وہاں جانے کا پروگرام بنا تھا۔ کینیڈا کے لوگ بڑے مہمان نواز اور زندہ دل ہیں۔ مہمان کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ اس لیے ناممکن تھا کہ صرف اکیلا میزبانوں کے ساتھ جایا جائے۔ دوست احباب بھی ایسے موقعے ڈھونڈتے ہیں۔ سو ایک پورا گروپ تیار ہو گیا تھا۔ لیکن جتنے لوگ اتنی رونق۔۔ ایک پکنک کا ماحول بن گیا تھا۔ اچھی خاصی گرمی کا دن تھا جس دن گئے۔ گرمی کی تمازت سے سب کے چہرے تمتمارہے تھے۔ لیکن وہاں پہنچ کر بہت اچھا لگا۔۔ لگتا تھا گھروں میں کوئی رہا ہی نہیں، سب یہیں چلے آئے ہیں۔ بہت سے لوگ چھاؤں میں بیٹھے تھے اور جن کو جگہ نہ ملی وہ دھوپ میں بیٹھنے پر مجبور تھے۔ بلفر پارک کے اندر بھی لوکیشن کے حساب سے چھوٹے چھوٹے پارک بنے ہوئے تھے۔ ایک نہر بھی تھی۔ اور بالکل بیچ کے پاس پانی کے قریب یہ نہر ایسے ہی لگ رہی تھی جیسے کوزے میں دریا بند کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ اور اس کے دوسری طرف پہاڑیاں بنی تھیں۔ اور اس لوکیشن کے سے ہٹ کر سائیڈ پر بیچ تھا۔ وہاں لوگ خوب انجوائے کر رہے تھے۔ لوگ بالکل پانی کے کنارے ریت پر کرسیاں بچھا کر بھی بیٹھے تھے۔ اور حد نظر تک پانی ہی پانی تھا۔ پانی کے قریب بگلے، مرغابی جیسی چیزیں بھی موجود تھیں۔ اور منظر بڑا دل لبھانے والا تھا۔ اوپر نیلا آسماں اور نیچے دور تک پھیلا ہوا سمندر نیلگوں پانی جس پر اوپر سفید اڑتے پرندے، واہ کیا منظر تھا۔ کیا فطرت تھی اور لوکیشن اپنا آپ منوا رہی تھی۔ لوگ جیسے

خود بخود پانی اور فطرت کے پاس کھنچے چلے آئے تھے۔ کینوس تو نیلا تھا البتہ اس کے کنارے رنگین ہو رہے تھے۔۔

پھولوں کی کیاریوں کی طرح لوگ پارک میں پھیلے نظر آ رہے تھے۔ اس وقت پارک کوئی پکنک سپاٹ دکھائی دے رہا تھا۔ ایشیائی لوگ بھی کافی دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے یہاں بھی چینیوں کی بہتات نظر آ رہی تھی۔ انگلینڈ، ہالینڈ اور جرمنی میں مجھے اتنے چینی دکھائی نہیں پڑے۔ اور جو ہیں وہ بھی جرمن کے لمبے لوگوں اور انگلینڈ کے گوروں کے مقابل کافی پست قد لگے۔ لیکن یہاں کینیڈا میں کافی لمبے چینی لوگ بھی دیکھے اور جو پست قامت تھے وہ بھی ایشیائی لوگوں کے ساتھ متناسب لگے۔ ویسے بھی یہ زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں اور آگے آ گے ہیں۔ اس لیے پارک میں بھی مجھے وہی نمایاں محسوس ہو رہے تھے۔ بفلر پارک ایک بہت بڑا پارک ہے۔ اور بیچ ساتھ ہونے کی وجہ سے یہاں بیک وقت پارک، گارڈن، پانی اور بیچ کا مزا لیا جا سکتا ہے۔ سو ایک ٹکٹ میں اتنے مزے تو لوگوں کی بہت بڑی تعداد یہاں نظر آتی ہے۔ ہم نے بھی وہاں خوب انجوائے کیا۔ کھانا پینا کیا، فوٹو بنائے اور پانی کے پاس وقت گزارنا تو بہت ہی اچھا لگا۔ کینیڈا میں لوگ اگر سیر و تفریح کے شوقین ہیں تو اسی کے مطابق پارک، گارڈن اور پکنک سپاٹ بھی موجود ہیں۔۔

کینیڈا میں بہت سی جھیلیں موجود ہیں۔ جو ٹورنٹو شہر کے اردگرد بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ انھی میں ایک خوبصورت انٹاریو جھیل بھی ہے۔ اس جھیل کے درمیان ایک جزیرہ ہے۔ جسے لوگوں کے لیے ایک تفریح گاہ بنا دیا گیا ہے۔ یہ پورا جزیرہ ایک طرح سے پھولوں اور فواروں کی وادی ہے۔ اور اس تفریح گاہ کو سنٹرل آئی لینڈ کہتے ہیں۔۔۔

سی۔این ٹاور

کچھ ملکوں کے حوالے کے لیے کوئی ایک خاص چیز، عمارت یا شخصیت ان کی خاص علامت بن جاتی ہے۔ جیسے تاج محل۔انڈیا، ایفل ٹاور۔فرانس، ہٹلر۔جرمنی، اسی طرح نیاگرہ فال۔کینیڈا کی سب سے بڑی پہچان ہے تو ٹورنٹو کی بڑی پہچان سی این ٹاور ہے۔ کینیڈا سے متعلق کوئی فوٹو دیکھ لیں یا سیاحت کرنے والے اس سے متعلق کوئی پوسٹ کارڈ، پکچر لیں تو یہ ٹاور سب سے نمایاں نظر آئے گا۔ دن کی روشنی اور رات کی روشنیوں میں جگمگاتا ہوا نمایاں محسوس ہوگا۔ ٹورنٹو کی ہائی بلڈنگز کے درمیان اس ٹاور کی اپنی اہمیت اور پہچان واضح ہے۔ ٹورنٹو میں آ کر یہ بھی پتہ چلا کہ سی این ٹاور ہی دنیا کا سب سے اونچا ٹاور ہے اتنی اونچائی پر پہنچ کر یہ لوگ شائد خود کی خودی آزمانا چاہتے ہیں۔۔
اس لیے یہاں آنے والے اسے دیکھنے ضرور جاتے ہیں۔ اور اس موقع کو ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتے۔ کیونکہ واپس آ کر دوست احباب کا پہلا سوال یہی ہونا تھا کہ سی این ٹاور دیکھا؟ اور جیسے لوگ لاہور دیکھے بنا نہیں رہ سکتے، اسی طرح یہ ٹاور بھی دیکھنا لازم ہے۔ جوں جوں بلندی کی جانب جائیں تو ویسے ہی دم ہوا۔ ہوا جاتا ہے۔ کیونکہ زمیں پیروں تلے سے نکل جاتی ہے۔ پھر سی این ٹاور کی لفٹ بھی شیشے کی بنی ہے۔ جس سے شہر صاف نظر آتا ہے۔ گھر یکدم کھلونا سے بن جاتے ہیں۔ اور ہائی بلڈنگز چھوٹے چھوٹے بلاکس میں بدل جاتی ہیں۔ اور جہاز والا منظر عیاں ہو جاتا ہے۔ خیر ہم تو دنیا میں کسی نہ کسی جانب سفر کرتے ہی رہتے ہیں۔ ورنہ بڑے بڑے لوگ بھی بلندی کی طرف سفر کرتے ہوئے کتراتے ہیں۔ اور اوپر پہنچ کر بھی بندہ ابھی دم لیا ہی چاہتا ہے کہ ایک اور نظارہ دل والوں کے امتحان کے لیے موجود ہے۔ فرش کا کچھ حصہ شیشے سے بنایا گیا ہے۔ کہ لوگ اس پر چل پھر کر اپنی بہادری آزما سکتے ہیں۔ اپنی خودی

کو للکار سکتے ہیں۔ سو کم لوگ ہی اس پر جانے کی ہمت کر پاتے ہیں۔ اور ان سے بے نیاز بچے اس پر آرام سے چل پھر رہے ہوتے ہیں اور مزے سے اوپر چھلانگیں بھی لگاتے ہیں۔ ہاں بھئی ایسی ہمت شائد ہراک کے بس کا روگ نہیں۔ اور اوپر سے نیچے جھانکنے کے لیے بھی حوصلہ چاہیے نا۔ کیونکہ بلندی کا فوبیا بہت سے لوگوں کو ہوتا ہے۔ جیسے اداکار سنجے دت کو بھی یہ فوبیا ہے۔۔

ڈاؤن ٹاؤن کے قریب ویسے بھی اونچی اونچی بلڈنگوں کی بھرمار ہے۔ جیسے سی این ٹاور کے قریب ہو کر وہ بھی اپنی اہمیت کا احساس دلا رہی ہوں۔ پھر بہت رش اور ڈھیروں لوگ۔ ایک رات ویسے ہی لانگ ڈرائیو کرتے ہوئے ہم ڈاؤن ٹاؤن کی طرف نکل گئے۔ اگست کا مہینہ تھا۔ گرمی اپنے جوبن پہ تھی۔ اور رات ہوتے ہی طوفانی ہوا بھی چلنا شروع ہو گئی۔ اور تھوڑی دیر بعد ہی ہلکی سی پھوار پڑنا شروع ہو گئی۔ جس سے تڑپتے دلوں کو تو قرار آیا ہی اور پیاسی زمین کی پیاس بھی بجھنے لگی۔ اور ایسے موسم میں گھر بیٹھنا اور دور سے نظارا کرنا دل کو ترسانے اور تڑپانے والی بات تھی۔ ایسے میں لانگ ڈرائیو تو بنتی ہی تھی نا۔ اور ماشاءاللہ، ہمارے میزبان بھی بڑے زندہ دل ہیں۔ ادھر موسم کو کچھ ہوا نہیں اور وہ ان لمحات سے کچھ نہ کچھ کشید کرنے لگتے۔ کبھی سیر، کبھی ہوٹلنگ، کبھی لانگ ڈرائیو۔۔ ان دنوں کوئی خاص تہوار یا موقع بھی نہیں تھا۔ پھر بھی ڈاؤن ٹاؤن میں بہت رش تھا۔ کہ ایک روڈ سے اس کے متوازی دوسری روڈ پر جانے کے لیے بھی گھنٹہ بھر لگ گیا۔ لیکن اس رات ڈاؤن ٹاؤن کی رونق بہت قریب سے دیکھی۔ اور وہ ۔۔ جگمگ جگمگ کرتی روشنیاں دیکھیں، جو روز رات کو دور سے ہمارا دل تڑپاتی تھیں۔۔۔

☆☆☆☆☆

ٹورنٹو کے کھانے

کسی دوسرے ملک میں جا کر وہاں کے کھانے بھی دلچسپ لگتے ہیں۔ اور ہم تو ایک ملٹی نیشنل ملک کے لوگوں کے مہمان بنے تھے۔ اس لیے اک رنگ محفل تھی اور ہم تھے۔ تب ہم جولائی اگست کی گرمی میں مہربانوں کی دعوت پر کینیڈا دیکھنے چل دیئے تھے۔ سوچا تھا نیاگرہ فال ہے نا، یہ علیحدہ بات ہے کہ گرمی ہم پر ایک طرح سے دھاوا بول دیتی ہے۔ بھوک بھی قدرتی کم ہو جاتی ہے۔ چائے بیزار کرنے لگتی ہے۔ موڈ بھی موڈی ہونے لگتا ہے۔ اور اندازہ نہیں تھا کہ۔۔ نہ۔۔ کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اور کسی کی خلوص بھری درخواست کو رد کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں تب ہوا جب کہیں بھی جاتے تو راستے میں میزبان اور کبھی ان کے دوست احباب ٹم ہارٹن کی فرنچ ونیلا کافی ہمارے آگے کر دیتے اور ہم جزبز ہو کر رہ جاتے۔ زباں گنگ ہو جاتی۔ مہربانوں کو کیسے بتاتے کہ ہم تو نارمل کافی بھی بہت ہی کم پیتے ہیں۔ دراصل ہماری نیند کو چائے، کافی سے مسئلہ ہو جاتا ہے۔ اور مہربان خلوص کے علاوہ اس نظریے سے بھی فرنچ ونیلا ہمارے آگے کرتے کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ یہ کافی صرف کینیڈا میں ہی ملتی ہے۔ سو وہ اس کی تعریف ہماری زبان زد کر کے پھر ہمیں جرمنی واپس بھیجنا چاہتے تھے۔ شروع میں ہم مروت کے مارے بیچارے اسے پکڑ کر پی لیتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت مزیدار کافی ہے۔ اسی لیے جگہ جگہ ٹم ہارٹن بنے ہوئے ہیں۔ اور لوگ کام پہ جاتے آتے، شاپنگ کرتے اسے شوق سے پیتے نظر آتے ہیں۔ تب ایک روز ہم نے چپکے سے میزبان کو بتا دیا کہ بلاشبہ کافی بہت مزیدار ہے۔ لیکن ہم اس کے لیے نہیں بنے ہیں۔ تب اگلی بار ایسے کسی موقع پر میزبان ایسی صورتحال سنبھال لیتے اور ہمارے لیے دوسرے متبادل جنجر ڈرنک، سی پلس، کوک کا انتظام کر لیتے۔۔۔

گرمی کی بدولت دعوتیں ذرا لیٹ رات کو ہوتیں۔تب ہماری پہلی دعوت رات کو۔۔تندوری ٹائم۔۔ ریسٹورنٹ میں ہوئی۔سیخ کباب،نہاری،چکن قورمہ،چکن بریانی،نان،سلاد،رائتہ مینو میں شامل تھے۔ چھوٹی چھوٹی مٹی کی ہانڈی میں گرم گرم بھاپ اڑاتے کھانے پیش کئے گیے۔اور بھوک کی کیفیت ہو تو کھانا اور بھی اچھا لگتا ہے۔میز بانوں کے علاوہ دوست احباب کا ایک پورا گروپ ہمارے ساتھ تھا۔اور چونکہ وہ دن نیا گرا فال گزار کر آئے تھے۔سو نیا گرا فال آنکھوں میں سمائی ہوئی تھی اور دوست احباب کی موجودگی اور رونق کا احساس ساتھ تھا۔سو سب نے جم کر دل لگا کر کھانا کھایا۔اور ایک اچھی سیر کے بعد مزیدار کھانا کھا کر سب خوش خوش ریسٹورنٹ سے باہر نکلے۔اور یوں وہ بھی ایک یادگار دن بنا۔۔

ہمارے قیام کے دوران ایک روز میز بان خاتون نے اپنی دوستوں سے متعارف کروانے کے لیے ایک گیدرنگ کی اور چائے کی چیزوں کا اہتمام کیا۔منع کرنے کے باوجود ان کی فرینڈز بھی ایک ایک ڈش لیے چلی آئیں۔سب بہت اچھی اور فرینڈلی تھیں۔جلد ہی گھل مل کر باتوں کے شوشے چھوڑنے لگیں۔ ان میں ایک دوست انڈیا سے مسلم فیملی سے تھی۔اس کی باتوں سے بہت محظوظ ہوئے۔ہم نے بھی اس سے انڈیا کے بارے میں تابڑ توڑ سوال کیے،جس کا وہ مسکرا کر جواب دیتی رہیں۔جیسے ہم نے پوچھ لیا کہ :جب آپ پڑھتی تھیں تو کیا آپ کو ہندی بھی پڑھنا پڑھتی تھی کوئی مسئلہ تو نہیں ہوتا تھا۔؟

تو اس نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ: ہاں ہندی زبان پڑھنی پڑھتی تھی۔کلاس میں ہندو مسلم سب لڑکیاں ہوتی تھیں۔اور ہمارے لیے مشکل مرحلہ تب ہوتا تھا۔جب ہماری کوئی ہندی کلاس فیلو سب کو پرشاد بانٹتی ہوئی ہم مسلمان لڑکیوں کے ہاتھ پہ بھی پرشاد رکھ دیتی تھی۔اور ہمارے لیے بڑی عجیب سچوئیشن بن جاتی تھی کہ اب ہم اس پرشاد کا کیا کریں۔اگر پھینکتے ہیں تو ان کو برا لگے گا۔اور کھانے سے تو رہے۔:

اس کی بات سن کر ہم سب مسکرانے لگے۔ وہ بھی ایک کھانے کی ڈش بنا کر لائی تھی۔ دیکھنے میں پکوڑا ٹائپ لگ رہی تھی۔بیسن اور پالک کا استعمال کیا گیا تھا،اور پالک کے پتوں کوتہہ درتہہ استعمال کیا گیا تھا کہ بنانے والے کی مہارت کا اندازہ ہورہا تھا۔سواس دن ہم سب پہلی بار انڈین ڈش۔۔ پاترا۔۔کھا رہے تھے۔ چیک کرر ہے تھے۔ذائقے میں وہ بس ٹھیک تھی۔ وہ جاتے ہوئے بچے ہوئے پاترا بھی میزبان کودے گئی۔ جوہماری میزبان کے شوہر نے جاب سے واپس آ کروہ پاترا کھالیے۔۔

اگلی بار ملنے پروہ دوست پوچھ رہی تھی کہ،

:ہمیں پاترا کیسے لگے؟

تو میزبان نے اپنی رو میں کہہ دیا،

:میرے شوہرکووہ بڑے پسند آئے،انھوں نے بہت شوق سے کھائے۔:

یہ سن کروہ پھولے نہ سمائی اوراب اکثروبیشتر اس کی طرف سے۔۔پاترا۔۔آنے لگے۔جسے دیکھ کرمیں اورمیزبان ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ کرمسکرادیتے۔سوفرنچ ونیلا کے بعد پاتراایسی ڈش تھی جسے ہم مہربانوں کی محبت کے باوجودکھانہیں پاتے تھے۔۔
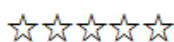
حویلی

ہماری اگلی یادگار دعوت ۔۔حویلی ۔۔میں ہوئی تھی ۔حویلی ایک بہت ہی خوبصورت ریسٹورنٹ ہے اور بینکوئٹ ہال بھی ،جہاں بیک وقت شادیوں کے فنکشن بھی ہوتے ہیں اور یہ مسی ساگا میں ہے۔حویلی کو بہت اچھے سے نام کے مصداق سجایا گیا ہے۔آرائشی پیڑ ھے بھی نظر آرہے تھے۔اور شادی کے مطابق اس کے ہال سجائے گئے ہیں ۔جس میں بیک وقت عام لوگ کھانا بھی کھاسکتے ہیں اور شادی ہال میں شادی کا فنکشن بھی چلتا رہتا ہے۔لوگ عام ریسٹورنٹ کی طرح کھانا اپنی ٹیبل پر منگوا کر بھی کھاسکتے ہیں اور بوفے سسٹم بھی موجود ہے۔اب یہ کھانے کے شائقین پر ہے کہ وہ جیسا پسند کرے۔اور پے منٹ کے حساب سے بھی زیادہ فرق نہیں ہے۔اس لیے دونوں طرح کے لوگ وہاں مصروف کام و دہن تھے۔جب ہم وہاں گئے تو کچھ لوگوں کو کھانا ویٹر ان کی میزوں پر سرو کر رہے تھے۔اور دوسرے لوگ خود جا کر اپنا کھانا اپنی میزوں پر لا رہے تھے اور بار بار لا رہے تھے۔۔

ہم نے بھی جا کر سب سے پہلے تو ایک گوشہ عافیت میں میز ڈھونڈی ۔تسلی سے بیٹھے اور پھر جائزہ لیا۔دوسری طرف شادی کا فنکشن بھی چل رہا تھا۔ فوفے سسٹم سے فائدہ اٹھانے کے لیے سب راضی بہ رضا تھے۔سوا ٹھے،سب نے اپنی اپنی پلیٹیں تھامیں اور پہنچ گئے۔کھانا بہت اچھا اور بہت سی ورائٹی میں نظر آرہا تھا۔سمجھ نہیں آرہی تھی کہاں سے بندہ شروع کرے۔دیسی کھانوں کے ساتھ ،چائنی ،اٹالی اور دوسرے بہت سے کانٹی نینٹل کھانے بھی نظر آرہے تھے۔ہم نے پلیٹ کے ایک کونے میں سلاد ڈال کر پلیٹ کو آباد کرنے کی کوشش کی۔اس کے بعد چکن بریانی کی چھوٹی سی پہاڑی بنائی۔جس پر کچھ تکے رونق کے لیے رکھے۔سیخ کباب لیا۔دوسری پلیٹ میں تھوڑی سی نہاری لی۔ایک طرف چکھنے کے لیے

ماش کی دال لی ، نان لیا ،رائتہ لیا اور اپنی میز پر پہنچ گئے ۔اب باقیوں کی طرف دھیان دیا ۔دیکھا کہ میری ساتھی میزبان پلیٹ میں سلاد ،پزا ،کٹلس اور تھوڑے سے نوڈلز نوش فرمارہی تھیں ۔اپنے سے اس کا پلیٹ مینو بالکل مختلف دیکھا ،اتنے میں وہ میرے دیکھنے پر کہنے لگیں ۔یہ ابھی صرف سٹارٹر ہے ۔نہاری ، بریانی اور نان سے ابھی بعد میں انصاف کروں گی ۔تب مجھے تسلی ہوئی ۔پھر اگلے چکر میں ۔۔میں پزا لے کر آئی اور وہ تب باقاعدہ کھانا اپنی پلیٹ میں سمیٹ لائی ۔کھانا بے حد مزیدار تھا ۔۔

ہمارے سامنے ہی دوسرے ٹیبل پر ایک ینگ کپل بیٹھا کھانا کھارہا تھا ،تو وہ لڑکا ۔۔بکرے کے پائے ۔۔بڑے شوق سے لا کر کھارہا تھا ۔اور اس کی ینگ وائف اس سے پوچھ رہی تھی کہ ۔

:یہ کیا ہے؟:

:یہ کونسی ڈش ہے؟:

تو وہ اسے بتارہا تھا ،

:پائے ۔۔بکرے کے پائے ۔:

اور وہ سمجھ نہیں پارہی تھی ۔

اور جب لڑکے نے اسے کہا کہ ،

:قدم ۔۔بکرے کے قدم ۔۔:

تو وہ فوراً سمجھ گئی ۔

کھانے اور وہاں کے ماحول میں آپس میں ہی کافی یگانگت لگ رہی تھی ۔اگر کھانا عمدہ تھا تو ماحول بھی پرسکون تھا ۔اک ہنگامے کے باوجود بھی طوفان بے تمیزی نہیں تھا ۔بس ماحول کا زیادہ فسوں تو چھری

کانٹے کی ہلکی سی آوازوں سے ٹوٹتا تھا۔نظر اٹھا کر دیکھو تو باوری ویٹر اپنی ڈیوٹی پر مصروف نظر آتے تھے۔
یا کسی کسی بوفے کے آگے چند ویٹر سرو کرنے کے لیے کھڑے تھے۔اور وہاں ان کا دم غنیمت لگتا تھا۔
تھوڑی تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلتا اور مزید لوگ اندر آتے دکھائی دیتے۔جس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ
حویلی یہاں واقعی ایک بینکویٹ ہال کے علاوہ مشہور ریسٹورنٹ ہے۔ورنہ میزبان تو پہلے ہی بتا چکے تھے۔
اور بہت سے لوگ یہ کہتے بھی نظر آئے کہ انھوں نے بھی اپنے شادی کے فنکشن یہیں ارینج کیے تھے۔۔
کھانے کے بعد روایتی میٹھے کی باری آئی ،جس کے بغیر کوئی دعوت مکمل نہیں لگتی۔ بلکہ ہمیں تو یہ بھی لگتا ہے
کہ کھانے میں مین کورس کی سات آٹھ ڈشز ایک طرف اور سویٹ ڈش ایک طرف۔ حالانکہ ہم وہ فرد
بالکل نہیں کہ میٹھا ہماری کمزوری ہو یا ہم اس کے بغیر رہ نہ سکیں۔لیکن نہ جانے کیوں پھر بھی کسی بھی دعوت
میں شرکت کرتے ہوئے یہ خواہش شدت سے دل میں موجود ہوتی ہے کہ میٹھے کی بے شک ایک ہی ڈش
ہو،لیکن روایتی ہو اور دل لگا کر بنائی گئی ہو۔ کیونکہ ہم نے اکثر دعوتوں میں دیکھا ہے اور نوٹ بھی کیا ہے
کہ میزبان اپنی پوری انرجی کھانے کی مین ڈشوں پر لگا دیتا ہے اور میٹھے تک آتے آتے اس کی غالبا بس
ہو جاتی ہے۔اور وہاں صرف خانہ پوری ہی کی جاتی ہے۔یا مہمانوں کے لائے ہوئے کیک ہی میٹھے کی
کمی پوری کر رہے ہوتے ہیں۔یا ایک دو مہربانوں نے میٹھے کی جگہ آئس کریم کھلا کے مہمانوں کے منہ بند
کر دیئے۔اور ایک بار ایک میزبان نے تو میٹھے میں پھل کاٹ کر رکھ دیئے یا پھلوں کی چاٹ رکھ دی۔اور
ہمارا دل جز بز ہو کر رہ گیا۔اونہوں۔۔ہم کوئی افطاری پہ تھوڑا آئے ہیں۔ہمارا دل شکوہ کناں ہو جاتا۔
لیکن اظہار نہ کر پاتے کہ یہ۔۔کیسا دستور زباں بندی ہے تری محفل میں۔۔مہربان،ذرا دل لگا کر اشرفی
والا زردہ بنایا ہوتا،یا کھیر میں پیار سے کڑچھی پھیری ہوتی یا کھوئے بادا موں والا گاجر کا حلوہ ہوتا۔آپ

کی محنت اپنے منہ سے بولتی تو اور بھی اچھا لگتا۔لیکن خیر یہاں۔۔حویلی میں ہمارے سامنے اتنے میٹھے تھے کہ دل باغ و بہار ہو گیا۔سو جو میٹھے ہم صرف مروت میں کھاتے ہیں ،انہیں ہم نے بالکل لفٹ نہیں کرائی۔ویسے راز کی بات بتائیں۔میٹھے کے لیے ہم ہمیشہ جگہ رکھتے ہیں۔اس لیے ان لوگوں میں نہیں آتے۔جو پیٹ بھر کر میٹھے کو حسرت سے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔سو ہم نے پہلے تھوڑا سا زردہ لیا۔پھر تھوڑی کھیر کھائی اور آخر میں مزیدار فالودہ کھایا،کیونکہ فالودہ دیکھ کر تو ہمیں وطن کی یاد بھی آنے لگی تھی۔ بھئی پاکستان جب بھی جائیں۔تو یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم وہاں سے فالودہ کھائے بغیر آ جائیں۔لیکن میں کچھ مہربانوں کے لیے واضح کر دوں کہ جناب یہ فالودہ ہے،فلودہ نہیں۔۔

اور ہماری میزبان نے مینگو آئس کریم کھائی ،اور ہم سے متاثر ہو کر انھوں نے بھی فالودہ ہی کھایا اور ساتھ یہ عذر بھی بتایا کہ وہ پہلے کھانا ڈٹ کر کھا چکی ہیں۔اس لیے اب میٹھے کے لیے جگہ ہی نہیں بچی۔اس بات پر ہمارے اندر پھلجڑی چھوٹی۔۔

سو ہمارا وہ دعوتی ڈنر بہت اچھا مزیدار رہا۔واپسی پر بھی گاڑی میں حویلی کے ماحول اور کھانے پہ بات کرتے آئے۔اور چپکے سے بتا دیں۔کہ زندگی میں کھائی بیشمار دعوتوں میں یہ ایک یادگار بوفے ڈنر تھا۔جسے ہم آج تک بھول نہیں پائے۔۔

☆☆☆☆☆

دہلی دربار

دو ہزار سات کے ٹور میں یہ ایک اور ہمارا یادگار دعوتی ڈنر تھا۔ یہ دعوت میزبان کے چند دوست احباب کی طرف سے ہمارے لیے کی گئی تھی۔ اور تب ہم دعوت پر دعوت کھا کر شرمندہ ہو رہے تھے۔ کچھ غریق فکر بھی تھے کہ ہم کینیڈا اپنا سمارٹ، متناسب فگر لے کر آئے ہیں۔ یہ نہ ہو جرمن واپس جا کر کسی ڈائٹ پر جانا پڑ جائے۔ اور بدمزہ سوپ اور ابلے کھانے کھاتے ہوئے ہم اپنے اچھے کھائے پیئے کو کوسیں یا ان مزیدار کھانوں کی یادیں ہمیں تڑپا تیں۔ اور یہ بھی عین ممکن تھا کہ جرمن والے دوست احباب ہماری اچھی صحت دیکھ کر ہمیں نظر ہی لگا دیتے۔ اور ہم ان کے تیر نظر کا شکار نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اور نہ ہی ان کی طرف سے کوئی اچھلتے ہوئے فقرے کیچ کرنا چاہتے تھے۔ سو میزبان کو پہلے ہی کہہ دیا کہ ذرا سوچ سمجھ کے ہمارا خیال رکھتے ہوئے کوئی دعوت قبول کریں۔ آخر کھا پی کر ہی ہم اتنے بڑے ہوئے ہیں اور وہ اس بات پر مسکرا دیئے تھے۔ اور ہمیں ان کی وہ مسکراہٹ کچھ ڈپلومیسی والی لگی اور لگے بھی کیوں نہ، آخر ان کی بھی ہمارے طفیل چاندی ہو رہی تھی۔ دعوت پہ دعوت۔۔ بلکہ در پردہ ان کا بھی لین دین، یاروں کی یاری اور اقرباء احباب سے حساب چکتا ہو رہا تھا۔ سو وہ ان مواقع کو گنوانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ الٹا وہ ہمیں منانے اور دعوت ہرگز نہ چھوڑنے کے لیے قائل کرنے لگے۔ کہ کفران نعمت نہ کریں بے فکر ہو کر دعوتیں کھائیں۔ ہم آپ کو سیریں بھی اتنی ہی کروائیں گے کہ آپ کا کھایا پیا ایک برابر ہو جائے گا۔ اور جیسے آئے تھے ویسے ہی جائیں گے۔ البتہ ایک تحائف سے بھرا سوٹ کیس ضرور اضافی ہوگا۔ اس کے لیے تیار رہیے گا اور منع مت کیجئے گا۔ یہاں ہمارا ملنے ملانے کا سسٹم ہی کچھ ایسا ہے۔ جب تک تحائف کا

سلسلہ نہ ہو دوسرے کی محبت اور خلوص پر کچھ شبہ ہی رہتا ہے۔۔

سو ہم صرف انھی چند دعوتوں کا ذکر زبان زد کر رہے ہیں۔ جو باہر ریسٹورنٹ میں ہوئیں۔ اور جو دعوتیں گھروں میں عزیزوں اور دوست احباب کی جانب سے ہوئیں۔ وہ اس سے علیحدہ تھیں۔ وہ محبت کی مار ہمیں علیحدہ ماری گئی تھی۔ یہ دعوت دوست احباب کی فیملیز کی طرف سے تھی۔ یہ بات طے تھی کہ یہ کسی ریسٹورنٹ میں ہی ہو گی۔ ہمارے سامنے انھوں نے کئی آپشن رکھے تھے۔ کئی مشہور ریسٹورنٹ کے نام، جن میں دیسی کے علاوہ چائنیز، اتالیز، اور میکسیکو کھانے کے آپشن بھی تھے۔ ہم بھلا کیا فیصلہ کرتے، ہم نے کوئی کسوٹی کھیلنے کی بجائے میزبان کو اپنا نائب مقرر کر دیا کہ ان کا فیصلہ مقدم سمجھا جائے۔ اور میزبان نے مسکراتے ہوئے یہ ذمہ داری لے لی تھی۔ اور ہماری شخصیت کے مزاج کو جیسے سمجھتے ہوئے ۔۔دہلی دربار۔۔ میں دعوت اوکے کر دی۔ ہمارے لیے دہلی دربار کا نام ہی نیا تھا۔ کیونکہ لاہور میں دہلی دروازہ تو کئی بار دیکھا تھا اور اس کے نیچے سے بھی گزر چکے تھے۔ اب یہ نام سن کر ایسا لگا کہ اب ہماری کسی دہلی دربار میں حاضری ہونے والی ہے۔ ہم اور تو زیادہ اندازہ نہ کر پائے، لیکن دہلی کی شد اور گاڑھی اردو کے لیے تیار ضرور ہو گئے۔۔

یہ بھی ایک شام کا ڈنر تھا۔ وقت مقررہ پر سب وہاں پہنچ گئے۔ اور جو ابھی نہ پہنچ پائے تھے ان کا انتظار کیا گیا، بلکہ ان کے خود فون آنے لگے کہ راستے میں ہیں، اتنی دیر تک پہنچ جائیں گے۔ سو ان کے آنے تک باتوں کا ماحول بنا رہا اور ویٹر کو بتا دیا گیا کہ کچھ احباب کا انتظار ہے اس لیے اندازاً اتنی دیر بعد کھانا آرڈر کریں گے۔ سو وہ تب تک لیے صاف چمکتے شیشے کے گلاس اور مینو کارڈ رکھ گیا۔ یہ بھی ایک بڑا ڈنر تھا۔ کئی میزوں کی بکنگ تھی۔ لیکن جب سب دوست احباب جمع ہوئے تو سب ایک دوسرے کے

قریب بیٹھ کر کھانا تناول فرمانا چاہتے تھے۔تو یہ سب دیکھ کر ریسٹورنٹ مینجمنٹ نے ہمارے لیے ترتیب بدل دی۔اور چار، چھ افراد کی میزوں کی جگہ سب کی میزیں ایک ساتھ لمبائی میں جوڑ دیں۔اور اسی ترتیب سے کرسیاں رکھ دیں۔اس طرح سب خوش ہو گئے اور سب احباب ایک دوسرے کے آمنے سامنے والی پوزیشن میں ہو گئے۔۔

دعوت ملنے کے بعد سے دعوت ہونے تک ہم خاصا سوچتے رہے تھے کہ دہلی دربار میں کیا ہو سکتا ہے۔کیا لوکیشن ہو گی، کیا منظر ہو گا جو یہ نام سوچا گیا ہے۔کبھی ہم سوچتے ریسٹورنٹ کا اونر دہلی سے ہو گا دہلی سے اسکی یادیں وابستہ ہوں گی۔یا ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے سمے ہمیں لگے گا، جیسے کسی دربار میں داخل ہو رہے ہیں۔اور کیا پتہ تب ہم پر کوئی پھول ہی وار دیئے جائیں۔ہماری سوچ یہاں تک بھی گئی کہ کیا پتہ ویٹر ہی کسی خاص دہلوی لباس میں ملبوس ہوں۔اور آپ جناب کر کے جھک کر پہلے ہمیں آداب، تسلیم بجالائیں اور پھر ہمیں گاڑھی اردو کی مار ماریں۔لیکن ایسا تو کچھ نہ ہوا، ہم نے خوامخواہ میں اتنے خیالی گھوڑے دوڑا لیے۔ریسٹورنٹ اچھا تھا، انتظامیہ بھی اچھی تھی۔ماحول کافی ڈارک تھا اور آہستہ آہستہ سلگ رہا تھا۔ہم ان کے پہلے گیسٹ تھے جو وہاں پہنچے۔لیکن سب کے جمع ہوتے اور کھانا شروع کرتے تب تک اور کئی لوگ آکر کھانا شروع کر چکے تھے۔اگست کا مہینہ تھا۔باہر ابھی کافی روشنی تھی لیکن اندر کے ماحول کو خصوصی طور پر تاریک کیا گیا تھا اور پھر اس اندھیرے پر ہلکی سی روشنی چھینکی گئی تھی۔ہم باتیں کرتے ہوئے کبھی شعوری تو کبھی لاشعوری طور پر اندر کے ماحول کو دیکھ رہے تھے، جانچ رہے تھے۔اور دہلی دربار والا عقدہ حل کرنے کی فکر میں تھے۔اور اسی کوشش میں بار بار دیواروں کو بھی گھور رہے تھے۔کہ شائد انھی کے ذریعے کچھ سراغ مل جائے۔اور اسی تلاش میں باتیں کرتے وہاں دیواروں پر لگی

تصاویر، سینریاں اور پورٹریٹ دیکھ چکے تھے۔ کہ شائد یہی دہلی کے ماحول یا خوبصورتی کو اجاگر کر رہی ہوں۔ اتنے میں کھانا لگنا شروع ہوا۔ تو اک پل میں ہی راز کھل گیا۔ جس کراکری میں کھانا سرو کیا جا رہا تھا وہ دہلی کلچر کو اجاگر کر رہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی خاص سٹائل کی ہنڈیا تھیں، جن میں کھانا سرو کیا جا رہا تھا۔ اور کھانا بھی ان میں اتنا جچ رہا تھا کہ کیا بتائیں، حلیم یہاں کی خاص ڈش لگی۔ اس کے بعد نہاری اور پائے بھی تھے۔ اور یہ ہمیں دہلی والوں کے عین مزاج بمطابق لگ رہے تھے۔ پھر چکن بریانی تھی۔ چکن سیخ کباب، نان، سلاد اور رائتہ کھانے کی رونق بڑھائے ہوئے تھے۔ کچھ نے مزے سے اور بہتوں نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے ساتھ ساتھ اس کی تعریفیں بھی چل رہی تھیں۔ اور تعریف کرنے میں بخدا ہم بھی کنجوس ہرگز نہیں ہیں۔ لیکن اس وقت باقی سب خود ہی اتنا دل کھول کر تعریف کر رہے تھے اور ایک دوسرے کو آفر کر رہے تھے کہ یہ بھی مزیدار ہے اور یہ بھی چکھو کتنا ٹیسٹی ہے۔ اور ہمارا تعریف کرنے کا موقع ہی چوک رہا تھا۔ پھر ہمارے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی ہو جاتا ہے کہ کسی دعوت میں ہوں تو کھانا جھٹ پٹ کھانا کھا کے فارغ ہو جاتے ہیں۔ دیر ہرگز نہیں لگاتے۔ بس یوں سمجھ لیں کہ شائد ہماری خوراک ہی ذرا کم ہے۔ اور آپ بھی کسی مغالطے میں نہ ہوئیے گا کہ ہم کسی لالچ میں جلدی جلدی کھا کر کام نبھیڑ دیتے ہیں۔ کھانا ہم صحت کے اصولوں کے مطابق ہی کھاتے ہیں۔ چبا چبا کر کھاتے ہیں۔ بلکہ ہم تو باتیں بھی چبا چبا کر کرتے ہیں۔ ہمارے اتنی جلدی فارغ ہونے پر دعوت میں احباب حیران و پریشان ہو جاتے ہیں۔ انھیں لگتا ہے کہ ہم نے کھانا کم کھایا ہے یا ممکن ہے ہمیں کھانا پسند نہیں آیا۔ سو ہمیں انھیں مطمئن کرنا پڑتا ہے کہ کھانا بہت ہی لذیذ، مزیدار اور سوادش ہے۔ کیا دل لگا کے بنایا گیا ہے۔ اور ان کا باقی کا ساتھ ہم کبھی پانی اور کبھی کوک، جنجر ڈرنک کے آہستہ آہستہ سپ لے کر دیتے ہیں۔ اور کھانے والے احباب کو کھانے کی تعریفیں کر کر کے مزید کھانے پہ اکساتے رہتے ہیں۔۔

دہلی دربار بجا۔۔۔اس کا مزیدار کھانا بجا۔لیکن ہم نے یہاں کوئی سویٹ ڈش نہیں کھائی۔اور اس میں بخدا مینجمنٹ کا کوئی قصور نہیں تھا کہ وہ ہمیں سرو کرنا بھول گئے ہوں۔یہ تو دعوت دینے والوں نے ہم سے چھپا کے ہمیں حیران کرنے کو ایک اور سرپرائز رکھا تھا۔ساڑھے دس بجے ڈنر سے فارغ ہونے کے بعد یہ ہمیں سیدھا۔۔کوئین۔۔۔لے گئے۔ ہمارے لیے سویٹ ڈش کا اہتمام وہاں کیا گیا تھا۔سو سب نے اپنی حسب منشا وہاں کی سپیشل آئس کریم کھائی اور کچھ نے ملک شیک لیا۔اور یوں مزید ایک گھنٹہ اس سارے ہنگامے کی نذر کر کے پھر جلد ملنے کا وعدہ کر کے سب احباب اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔اور ہم بھی دل میں ایک اچھی دعوت کی یاد اور آنکھوں میں نیند لیے گھر کو روانہ ہوئے۔۔

اپما اور ہم

اگلی دعوت ایک چائنی ریسٹورنٹ میں ہوئی۔وہ بھی دوست احباب کی جانب سے تھی۔ جو اچھی رہی۔ہمیں پسند تو زیادہ اپنے کھانے ہیں۔لیکن کبھی کبھی باقی سب کا خیال بھی کرنا پڑتا ہے۔کیونکہ دیسی کھانے تو گھر کی دعوتوں میں بھی وافر ہوتے ہیں۔اس لیے گھر سے باہر نکل کر تو کوشش ہوتی ہے کہ کچھ نیا چیک کیا جائے۔کھایا جائے۔ کچھ دل میں یہ بھی خیال تھا کہ بھئی آخر چینی لوگوں کو بھی اپنی خدمت کا کچھ موقع دیا جائے۔سو یہاں چائنی سوپ سٹارٹر کی طرح لازم تھا۔اسی سے شروعات کی گئی۔اس کے بعد مین کورس آیا۔چائنی فرائڈ رائس،چکن منچورین،تیکھے انداز کا سپائسی چلی چکن،شاشلک اور نوڈلز مینو میں شامل تھیں۔ایک ڈش اور بھی تھی۔دیکھنے میں پکوڑے ٹائپ کی لگ رہی تھی،جسے دوست احباب چائنی پکوڑے کہہ کر سوس کے ساتھ مزے سے کھائے جا رہے تھے۔یہ بھی ایک اچھا ریسٹورنٹ تھا اور لوگوں کی لگا تار آمد یہ احساس دلانے کے لیے کافی تھی کہ کافی مشہور ہے۔اس کا نام پتہ نہیں کیا تھا۔؟ کیا کریں ہمیں دیسی لوگوں،دیسی جگھوں کے نام خوب یاد رہ جاتے ہیں۔ویسے بھی ہم نمبر تو کھانے کو دیتے ہیں۔ اور کھانا اچھا تھا۔اس کے بعد بھی اکثر چائنیز کھانا کھاتے رہے۔کبھی میزبان خود گھر آتے ہوئے ریسٹورنٹ سے پیک کروا لاتے۔اور ایک بار ایک عزیز فیملی ملنے کے لیے آئی اور آتے ہوئے چائنی ریسٹورنٹ سے کھانا بھی پیک کروا کے لے آئی۔ یہ طریق کار بھی ہمیں بہت اچھا لگا کہ کھانے کے وقت میزبان کو ناحق زحمت سے بچانے کے لیے وہ خود ہی یہ سلسلہ کرتے آئے۔ ماشاءاللہ،اللہ انہیں خوش رکھے۔ایسے مہمان ذرا نایاب ہیں۔لیکن ہیں ضرور۔۔

ملٹی نیشنل بھانت بھانت کی بولیوں والے ملک میں میزبان خاتون کی دوستیں بھی رنگ

رنگ کی تھیں۔ زیادہ تو پاکستانی ہی تھیں لیکن ان کے علاوہ انڈین، بنگالی، سری لنکا، افغانی، چینی دوست بھی تھیں۔ سو ان سے ہماری بھی چند بار ملاقات ہو گئی۔ وہ جب بھی ملتیں اپنے گھر آنے کے لیے بلاتیں۔ ایک روز ہم نے بھی ہمت کر ہی لی۔ خوب گرمی کا دن تھا۔ ایک انڈین دوست کو میزبان نے فون کیا اور ہم اس کی طرف چلے گئے۔ ایک ہائی بلڈنگ میں اس کا گھر تھا۔ چوبیسویں منزل پر اس کا گھر تھا۔ کچھ زیادہ ہی بلندی پر۔۔ اللہ کا شکر کینیڈا میں لوڈ شیڈنگ کا سلسلہ نہیں۔ ورنہ وہاں نیچے والے اوپر نہ جا پاتے اور اوپر والے بلندی پر ہی رہتے۔ لفٹ میں قدم رکھتے ہی چند سیکنڈ میں ہم اوپر پہنچ چکے تھے۔ اس دوست کے گھر سے اتنا اچھا ویو بنتا تھا کہ ہم گرمی کی شدت اور اتنی اونچائی سب کچھ بھول گئے۔ وہ ہمیں اپنے گھر پا کر اتنی خوش ہوئی کہ اس نے اس نے فون کر کے اپنی بہن کو بھی بلا لیا۔ جو قریب ہی کسی بلڈنگ مین مقیم تھی۔ سو مزید رونق دوبالا ہو گئی۔ تب اس دوپہر انھوں نے ہمیں انڈین ڈش۔۔ اپما۔۔ بنا کر کھلائی۔ جس کا ہم نے پہلے صرف ہندی فلموں میں ہی نام سنا تھا۔ ڈش مزیدار لگی یا نہیں، لیکن ہمیں اس کا نام بڑا پسند آیا تھا اپما۔۔

واپس گھر آ کر ہم میزبان سے پوچھ رہے تھے کہ کیا اس کی کوئی اور انڈین دوست بھی ہے تو ہمیں جلدی سے اس سے بھی ملوا دے۔ کیا پتہ، وہ ہمیں۔۔ وٹا ٹا وڑا۔۔ ہی کھلا دے۔ یہ سن کر میزبان مسکرانے لگی۔ میزبان کے گھر کے سامنے ہی ایک افغانی ریسٹورنٹ تھا۔ جہاں پاکستانی لوگوں کی ایک بڑی تعداد کھانا کھانے آتی تھی۔ بہت مشہور ریسٹورنٹ تھا۔ ایک دن میزبان ہمیں سرپرائز دیتے اچانک وہاں کھانا کھلانے لے گئے۔ بہت مزیدار کھانا تھا۔ اچھی بات یہ لگی کہ کھانا اتنا زیادہ سرو تھا کہ دو بندے کے آرڈر میں چار لوگ بآسانی کھا سکتے تھے۔ خاص انداز کے چاول، چپلی کباب اور میٹ آئیٹم شامل تھیں۔

فلم ،میلہ اور اگست

ماہ اگست میں کینیڈا میں بڑی رونق کا احساس ہو رہا تھا۔ کیونکہ ہر طرف کچھ نہ کچھ ہو رہا تھا۔ کہیں کنسرٹ، کہیں جیرالڈ سٹریٹ پر چودہ، پندرہ اگست کے حوالے سے پروگرام اور اس کے بعد وہیں اگلی تاریخوں ایک میلہ بھی ہونا تھا۔ اور سینما حال میں نئی نئی فلموں کے آنے کی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔ ان دنوں شاہ رخ کی فلم اوم شانتی اوم آنے والی تھی اور اس کے گانے بہت مشہور ہو رہے تھے۔ میزبان کی گاڑی میں بھی کئی بار یہ گانا بجا کرتا۔

آنکھوں میں تری عجب سی عجب سی ادائیں ہیں
دل کو بنا دے جو پتنگ سانسیں یہ تری وہ ہوائیں ہیں

تب ایک روز میزبان نے فلم دیکھنے کا پروگرام بنالیا۔ سو رات کا شو دیکھنے سینما چلے گئے۔ پہلے باہر ایک جگہ کھانا کھایا اور پھر تسلی سے سینما ہال کا رخ کیا۔ یہاں بھی ایک ہی جگہ مختلف زبان کی فلمیں لگی ہوئی تھیں۔ کافی لوگ جیکی چین کی فلم دیکھنے کے لیے اس ہال کا رخ کر رہے تھے۔ ان دنوں ابھی حال ہی میں اکشے کمار اور ودیا بالن کی فلم ۔۔ بھول بھلیاں ۔۔ ریلیز ہوئی تھی۔ سو کافی لوگ اسی فلم کا ہی زیادہ نام لے رہے تھے۔ میزبان نے بھی ہم سب کی رائے جاننا چاہی۔ تو ہم نے انتخاب انہی پر ہی چھوڑ دیا۔ کیا کرتے مرضی تو تب کرتے جب مرضی کی فلم لگ رہی ہوتی۔ فلم بھول بھلیاں کے ٹکٹ لے لیے گئے۔ ہم سینما ہال کے اندرونی مین حصے میں کھڑے تھے۔ جہاں سے ٹکٹ لے کر لوگ مطلوبہ ہال کی طرف بڑھ جاتے تھے۔ اور یہاں اس حصے میں رنگ رنگ کے لوگ تھے، ایک بڑی سکرین بھی تھی۔ جس پر اگلے

دنوں میں مادھوری دکشٹ کی فلم ۔۔آ جا نچ لے۔۔ ریلیز ہونے والی تھی ۔اور اسی فلم کا ٹریلر بار بار اس سکرین پر دکھایا جا رہا تھا۔ چونکہ کافی عرصے بعد مادھوری کی فلموں میں واپسی ہو رہی تھی ۔تو لگ رہا تھا کہ پبلک اور سینما والے بھی سب بڑے انتظار میں ہیں ۔ مادھوری کے ڈانس کا ایک سین بار بار دکھا رہے تھے۔ بڑی سکرین اور خوبصورت مادھوری کے رقص کا ایک خوبصورت سین اور پوز بار بار نمایاں کر رہے تھے۔ اور اس کے چہرے تک کیمرا آتے آتے سین ختم ہو جاتا ۔ یہ سین وہاں کھڑے کھڑے ہم نے کئی بار دیکھا جب تک میزبان فلم کی ٹکٹیں لے کر نہ آ گئے ۔ اور ہم وہاں کھڑے سوچ رہے تھے کہ سینما میں بڑی سکرین پر فلم دیکھنے کا موقع بھی مل رہا ہے پر وہ اپنی پسند کے مطابق نہیں ۔کاش یہاں پر ساٹھ سے اسی کی دہائی تک کی کوئی فلم لگی ہوتی ۔تو ہم خوشی سے اتاولے ہو جاتے ۔ دل سنبھالے نہ سنبھلتا۔ کیا تھا اگر دلیپ کمار، سنیل دت، دھرمیندر، راجندر کمار، دیو آنند، مدھو بالا، وحیدہ رحمان، مینا کماری سمیتا پاٹل، جیا بہادری، شرمیلا ٹیگور ہی کی کوئی فلم دیکھنے کو مل جاتی ۔اور نہیں تو کم از کم فلم ۔۔ پاکیزہ ۔۔جیسی کلاسک فلم ہی ہمارے مقدر میں ہوتی ۔ ویسے ایسی کوئی بات نہیں، ہم مادھوری ڈکشٹ کے بھی بڑے فین ہیں ۔ اس کی فلم ۔۔کھیل ۔۔ ہماری پسندیدہ فلم رہی ہے۔ مس جڑی بوٹی، کاش اسی کی فلم ہی یہ سینما والے دکھا دیتے ۔ پر کیا ۔۔کیا جا سکتا تھا ۔ ہماری قسمت میں بس درمیانے سے اداکاروں کی فلم تھی ۔ اکشے کمار اور ودیا بالن ۔۔ اکشے کمار ویسے ہی ہمیں اوور ایکٹنگ کرتا محسوس ہوتا ہے۔ اور ودیا بالن کی اس سے پیشتر صرف ایک ہی فلم ۔۔ پرینیتا ۔۔ دیکھی تھی ۔صرف ایک فلم کی بنا پر اسے کیسے ترجیح دے دیتے۔ فلم کی کاسٹ بس درمیانی سی تھی ۔ اس لیے بس نارمل سی کیفیت تھی ۔فلم سسپنس سے بھرپور رہی ۔ کچھ مزاحیہ، زیادہ مسٹری تھی ۔ بس ٹھیک ہی رہی ۔فلم میں میوزک بھی کم تھا کیونکہ فلم زیادہ کہانی پر فوکس تھی ۔

اگست کے درمیان ہم جیرالڈ سٹریٹ گئے۔ جس کے بارے میں ہمیں پہلے ہی سب دوست احباب بتاتے رہے کہ یہاں ایک ایسا بازار ہے جو بالکل پاکستان انڈیا کے بازاروں جیسا ہے۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوتا ہے گویا ہم اپنے ملک کے کسی بازار میں کھڑے ہیں۔ سو بار بار یہ بتا کر ہمارے شوق کو کافی ہوا دی جا چکی تھی اور ہم بھی اشتیاق میں تھے۔ پہلے جیرالڈ سٹریٹ پر موجود لائبریری میں گئے۔ ٹورنٹو کی سب سے بڑی لائبریری بھی یہی ہے۔ وہاں ہمیں اردو کتابوں اور ناولز کی بہت بڑی کولیکشن دکھائی پڑی تھی۔ پر وہ لائبریری گھر سے کافی دور تھی، اس لیے تب ہم صرف دو تین بار ہی وہاں جا سکے تھے۔ لائبریری سے باہر نکلے تو جس سٹریٹ کی ہم نے اتنی تعریف سن رکھی تھی۔ وہ لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ کوئی ساؤتھ انڈین میلہ لگا تھا۔ ہم جلدی سے کپڑوں کی دو کانوں میں چلے گئے۔ اور ریڈی میڈ ڈریس اور ان سلے کپڑے دیکھتے رہے۔ ان کی قیمت خاص طور پر نوٹ کرتے رہے۔ دل میں حساب بھی لگاتے کہ کتنے پاکستانی روپے اور کتنے یورو میں پڑے گا۔ لیکن شاپنگ کرنے کا پروگرام اگلی بار کے لیے رکھا۔ آج صرف انفارمیشن درکار تھی۔ باہر نکلے تو دیکھا کہ مین چوک پہ درمیان میں سٹیج لگا ہے اور بالی وڈ کے گانوں پر ڈانس ہو رہا تھا۔ وہ ختم ہوا تو گدا شروع ہو گیا۔ لوگ خوب محظوظ ہو رہے تھے۔ ہمیں بھی اچھا لگ رہا تھا، کیونکہ جرمنی میں تو ایسے پروگرام ناممکنات میں سے تھے۔ اس انجوائے منٹ کے ساتھ ساتھ وہاں سموسے کھائے۔ اور تھوڑی دیر بعد گلاب جامن سے منہ میٹھا کیا۔ حالانکہ اس وقت میٹھے کا کوئی جواز تو نہیں تھا لیکن گلاب جامن بھی کیا خوب تھے موٹے، میٹھے اور رسیلے۔ پھر میزبان نے نان تکے گھر کے لیے پیک کروا لیے۔ یوں وہ بھی ایک اچھا دن گزرا۔ اور گدا ڈالتی لڑکیوں کو داد دینے کے لیے تالیاں بجاتے ہوئے ہم نے بھی گھر کی راہ لی۔۔

اپنے اپنے خول

چینی لوگوں کو اب تک ہم ہر جگہ دیکھ چکے تھے، اگر نہیں دیکھا تھا تو پاکستانی انڈین بازار میں نہیں دیکھا۔ ورنہ ہر جگہ ہمیں انھی کی بہتات محسوس ہو رہی تھی۔ ان کا کھانا بھی ہم نوش فرما چکے تھے۔ اور خاص طور پر یہ انٹاریو سائنس سینٹر میں بہت نظر آتے تھے۔ پکنک سپاٹ پر بھی یہی ہر طرف چھائے ہوتے۔ شاپنگ سنٹر میں یہ نظر آتے۔ کئی ملکوں میں نسلی تعصب کے ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ خاص طور پر ایشیائیوں کے ساتھ تو یہ برملا نظر آتا ہے۔ اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات بھی نہیں رہی۔ جرمنی میں اول تو پاکستانی اتنے نہیں جتنے روسی، ترکی، عربی اور پھر بلترتیب پاکستانی، انڈین، بنگالی، سری لنکا اور ایرانی لوگ ہیں۔ اور جرمنوں کے نزدیک سارے غیر ملکی ہیں۔ اس لیے یہ امتیاز نہیں کہ کسی پر یہ نظر عنایت کریں۔ اور دوسرے ملک جا کر تو بندہ ہر صورت اقلیت میں ہی گنا جاتا ہے، اب چاہے وہ تعداد میں زیادہ ہوں یا کم۔ کینیڈا آ کر ہم نے جب اس نظریے سے جانچنا چاہا تو پتہ چلا کہ بہت سی قومیتیں اور تعداد میں بھی زیادہ ہونے کے باوجود یہاں تھوڑا بہت تعصب تو یہاں بھی ہے۔ لیکن شکر ہے کہ بہت زیادہ نہیں البتہ یہ بات ہم نے یہاں بھی واضح دیکھی کہ ہر قوم کے لوگ سب سے پہلے اپنی برادری کو اہمیت دیتے ہیں۔ اور دوسروں کو ذرا کم لفٹ کرواتے ہیں۔ کام، جاب اور بزنس کی اور بات ہے، وہاں سب لوگ مکس ہو کر کام کرتے ہیں۔ اس حوالے سے اپنے نارمل رویے برتتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی ان کی ذاتی زندگی کی حد شروع ہوتی ہے۔ اور ذاتی معاملات سامنے آتے ہیں۔ وہاں یہ لوگ اپنے اپنے خول میں گھس جاتے ہیں۔ اور تب ان کی دنیا اپنوں اپنوں کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ پھر یہ اپنی ذات برادری کو اہمیت دیتے ہیں۔۔

اور یہاں کینیڈا میں تو بہت سارے برتن تھے تو کھڑ کنا لازمی تھے۔ ہمیں کافی حیرت ہوئی جب دیکھا کہ اکثر پاکستانی لوگ جب بھی بات کرتے تو چینیوں کو۔۔ چپٹے۔۔ کہتے۔ پہلے تو ہمیں پتہ ہی نہ چلا کہ یہ کسے۔۔ چپٹے۔۔ کہا جا رہا ہے۔ جب غور وفکر کیا اور جاننا چاہا تو علم ہوا کہ چینیوں کو ان کی ادھ کھلی آنکھوں اور چپٹی ناک کی بدولت یہ ٹائیٹل ملا ہوا ہے۔ اور جب ہم نے مسکراتے ہوئے کہا کہ پھر تو انھوں نے بھی آپ کا کوئی نام تو رکھا ہوگا۔ تو پتہ چلا کہ صرف چینی ہی کیوں؟ باقی ساری قومیتیں بھی وہاں پاکستانیوں کو۔۔ پیکی۔۔ کہہ کر چڑاتے ہیں۔ حبشیوں کو۔۔ نیگرز۔۔ جرمنوں کو۔۔ ہٹلر۔۔ اور اسی طرح باقی قومیت کے لوگوں کے چڑانے کے نام رکھے ہوئے ہیں۔ ہمیں ہنسی تب آئی جب پتہ چلا کہ ان ساری قومیتوں نے کنیڈین لوگوں کو بھی چڑانے کا نام دے رکھا ہے۔۔ بنانا فیس۔۔،

چینی بازار

جیرالڈ سٹریٹ کی طرح۔۔ چائنیز مول۔۔ کا ذکر بھی ہم بار ہا سن چکے تھے۔ کہ جس طرح پاکستانی اور ہندوستانی کا ایک مشترکہ بازار ہے وہیں چینی لوگوں کا اپنا بازار ہے۔ صرف اپنا۔ وہاں بس وہ ہیں اور ان کا تام جھام، سو ایک روز ہمارا پروگرام چائنا ٹاؤن دیکھنے کا بن گیا۔ اور ہم وہاں جا پہنچے۔ یہ واقعی کوئی عام بازار نہیں تھا اور ایشیائی بازار سے تو یکسر الٹ تھا۔ یہ تو ایک خوبصورت پلازہ تھا۔ صاف ستھرا، چمکتا دمکتا، جسے چینیوں نے جدید ترین طرز کی مارکیٹ بنا لیا تھا۔ ہر طرف چینی اپنی دکاں بڑھائے بیٹھے تھے۔ ہمیں یہ چینی مال کافی دلچسپ لگا۔ کچھ چیزوں کی خریداری بھی کی۔ وہ مساج کرنے والی چیئرز ہم نے سب سے پہلے اسی چائنی مال میں دیکھی تھیں۔ جس پر بیٹھ جاؤ اور دو ڈالر کا سکہ ڈال دو تو کیا مزے کا مساج کمر اور کندھوں میں ہوتا ہے۔ اور عمر سے بالاتر ہر طرح کے لوگ مجھے ان مساج کرسیوں پر بیٹھے نظر آئے۔ جرمنی آ کر یہ دیکھی نئی چیز میں سب کو بتاتی لیکن بہت جلد ہی یہ مساج چیئرز جرمنی میں بھی آ گئیں اور خاص طور پر نئے بنے پلازہ میں ضرور یہ رکھی جاتی ہیں۔ بس فرق یہی لگا کہ وہاں دو ڈالر کا سکہ ڈالا جاتا اور یہاں دو یورو کا۔ چینی لوگ مجھے کافی رونق والے لگے۔ بے شک ان کا اپنا رجحان زیادہ اپنی کمیونٹی کی طرف ہی ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ آپس میں خوب باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ کوئی شاپنگ سینٹر ہو یا کوئی سکول یا کوئی پکنک سپاٹ۔۔ یہ کافی مزے سے اونچی آواز میں بات کرتے نظر آ جاتے ہیں۔ اور بے تکلفی سے ہنس بھی لیتے ہیں۔ قہقہہ بھی لگا ہی لیتے ہیں اگر لگانے کا دل کرے تو۔۔

☆☆☆☆☆

جیرالڈ سٹریٹ اور شاپنگ

جیرالڈ سٹریٹ پر پاکستانی، انڈین ایشین بازار میں ہم ایک بار تو ہو ہی آئے تھے۔ پر یہ ایسی جگہ تھی کہ یہاں بندہ کئی کئی بار جا سکتا ہے۔ اپنے ملک کے کلچر، ماحول اور بازار کی جھلک وہاں اچھی خاصی مل جاتی ہے۔ ہم اتنی دور سے یہاں آئے تھے اور اس بازار جا کر جو اپنائیت ملی تو آنکھیں نم ہونے لگی تھی۔ تو یہاں رہنے والے تو اکثر یہاں آتے رہتے ہیں۔ اور یہ بازار بھی انہیں اپنی اور کھینچتا رہتا ہے۔ بہت سے ایشیائی میلے بھی یہیں لگتے ہیں۔ اور تب یہاں کی رونق اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کھوئے سے کھوا چھلتا ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ لیکن اتنی بھیڑ، رش کے باوجود بھی وہاں جانے سے نہیں رہا جا سکتا۔ سو ایک ہفتے کے بعد ہی ہم وہاں دوبارہ جا پہنچے۔ دوپہر کے وقت وہاں پہنچے تو ماحول خوب جم چکا تھا۔ گاڑی سے اترتے ہی تیز میوزک اور شور شرابے کا ماحول نظر آنے لگا۔ بازار کے بالکل درمیانی حصے میں شور کا طوفان اٹھتا محسوس کیا۔ پارکنگ کے لیے جگہ بھی بڑی مشکل سے پیچھے کسی اندرونی روڈ پر ملی تھی۔ میلے کی وجہ سے جگہ جگہ کاریں کھڑی تھیں۔ کہیں قریب وہاں پارکنگ ملنا تو بہت ہی مشکل تھا۔ وہاں سے تقریباً آٹھ دس منٹ پیدل مسافت پر بازار تھا۔ ہم بازار میں نکلتے ہی بالکل کونے پر موجود لائبریری میں چلے گئے۔ پہلی کتابیں واپس کیں، کچھ نئی ایشو کروائیں اور لائبریری سے باہر نکلے۔ رنگ محفل پچھلے میلے سے بھی زیادہ جما تھا۔ اور بازار کے عین بیچ لگے سٹیج پر۔۔ ڈانڈیا۔۔ کھیلا جا رہا تھا۔ ہم نے بھی کچھ دیر انھیں دیکھا اور انجوائے کیا۔ پھر اس دن والی دیکھی ذہن میں محفوظ کپڑوں والی دوکان میں گھس گئے۔ اور کچھ کپڑوں کی خریداری کر ڈالی۔ وہاں سے نکلے تو پائل جیولرز والوں کے ہاں چلے گئے۔ اور وہاں سے خوبصورت سی تین رنگز، ایک بریسلٹ اور ائیر رنگز خرید لیے۔ ہمارا یہ سودا کامیاب رہا کہ نہیں۔ یہ تو جرمنی آ کر پتہ چلا

جب باقی احباب اسے دیکھ کر کمنٹ کرتے۔ کیونکہ ہمارا ماننا ہے کہ سب چیزوں کی شاپنگ اپنی مرضی سے کرڈالیے، لیکن جب بھی گولڈ کی جیولری لینی ہو اور وہاں رتی، ماشے، تولے، اور گولڈ کے اصل ہونے اور کھوٹ کی موجودگی کا خدشہ ہو تو ہمیشہ حفظ ماتقدم کے طور پر اس خریداری میں ماہر کسی فرد کو ساتھ رکھے، جو سنار کو اسی کی بھاشا میں مات دے سکے۔ میری خوش نصیبی کہ اس وقت میرے ساتھ مہربان ماہر میزبان خاتون موجود تھیں، اس لیے کسی گھپلے کا احتمال کم تھا۔ اور انگلینڈ میں بھی ایک رشتہ دار خاتون ان کاموں میں تجربہ کار میسر ہے۔ ورنہ یہ حسابی کتابی جوڑ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اب یہ بھاشا کچھ کچھ ہمیں بھی سمجھ آنے لگی ہے۔۔

خریداری سے فارغ ہو کر اب ہمارے پاس وقت ہی وقت تھا۔ سٹیج پر ڈانس کا ماحول چھایا ہوا تھا۔ کبھی گدا ہونے لگتا اور کبھی بالی وڈ ڈانس، لوگ خوب انجوائے کرر ہے تھے۔ لگتا تھا آج سب فرصت سے ہیں۔ سٹیج کے گرد تو بہت ہی رش تھا۔ لیکن سٹیج چونکہ کافی اونچا بنایا گیا تھا اور مائیک کا بھی انتظام تھا اس لیے لوگ کافی دور سے بھی دیکھ پا رہے تھے۔ اس لیے سٹیج کے قریب جانے کے لیے کوئی دھکم پیل کا سماں نہیں تھا۔ جسے جہاں جگہ مل رہی تھی وہ وہیں سمایا ہوا تھا۔ جیرالڈ سٹریٹ کی عام دوکانوں کے علاوہ بھی روڈ پر جا بجا چیزوں کے سٹال لگے ہوئے تھے۔ جن پر کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ دوسری علاقائی، ثقافتی کلچر کی چیزیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ آج ہم نے چنا چاٹ کھائی، اور کچھ دیر بعد پھر سموسہ پلیٹ لی۔ کافی تیکھا تیکھا ذائقہ لگا۔ تب ایک جگہ وہ خاص مٹی کی چھوٹی سی پلیٹ میں جمی ہوئی فرنی کھا کر نمکین میٹھے کا حساب برابر کیا۔ موسم آج بھی بہت اچھا تھا۔ دن کھلا کھلا روشن تھا۔ گرمی تھی۔ پر نظارے بھی خوب تھے۔ اور اس دن سے زیادہ آج رونق اور بھیڑ تھی۔ یہاں فوٹو بھی بنائے۔ جرمنی والے دوست احباب

کی زبردست تاکید تھی کہ ہم کینیڈا جاکر وہاں کے مناظر کو اپنے کیمرے میں ضرور مقید کر کے لائیں۔ سو یہ کام ہم اکثر و بیشتر کرتے رہتے تھے۔۔

ایک سٹال پر ہمیں میوزک سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز فلمیں لگی نظر آئیں تو ہمارے سامنے میلے کا رنگ کچھ اور واضح ہونے لگا۔ سو یہاں بھی کچھ مطلوبہ مواد مل گیا۔ آگے بڑھے تو ایک جگہ روایتی، ثقافتی ماحول دیکھ کر مزا آ گیا۔ پاکستانی چارپائی، پیڑھا اور حقہ پڑھا ہوا تھا۔ دیکھ کر پنجاب یاد آ گیا۔ اوران عام چیزوں کی خاص بات یہ تھی کہ گولڈ، سلور تاروں سے چارپائی بنائی گئی تھی۔ اور پیڑھا بھی ویسا ہی تھا اور ایک طرف حقہ، دلچسپ ماحول تھا، سو ہمیں بھی چارپائی پر بیٹھ کر فوٹو کھنچوانا پڑی اور میزبان کے کیمرے کی نذر کرنی پڑی۔ وہ دن بھی گرمی کی تمازت کے باوجود یادگار رہا۔ اس کے بعد ہمارا ایک چکر اور بھی جیرالڈ سٹریٹ پر لگا تھا، لیکن تب نہ کوئی میلہ تھا اور نہ ہی کوئی اور ہنگامہ۔ بس ایک عام اور روٹین کا دن تھا۔ لیکن پھر بھی وہاں کافی رش تھا اور جس چیز نے پہلی نظر متاثر کیا۔ وہ یہ تھی کہ بازار میں داخل ہوتے ہی سامنے گنے کا رس نکالتی مشین کا نظارا تھا۔ اور یہ منظر دیکھ کر یہ خیال مزید تقویت پکڑ گیا کہ واقعی یہ ایشیائی بازار بالکل ہمارے ملکوں جیسا ہے اور ایک گلاس گنے کا رس پی کر تو یہ خیال اور بھی تقویت پکڑ گیا۔ کچھ لوگ اسے جیرالڈ سٹریٹ کہتے ہیں، کچھ جراڈ سٹریٹ اور کچھ دیسی مہربانوں کو میں نے جارج سٹریٹ بھی کہتے سنا تو دل میں خوب پھلجڑی چھوٹی۔۔ اور تب بے اختیار فلم ایک پھول چار کانٹے یاد آ گئی۔ کچھ مہربان اسے منڈی بھی کہتے ہیں۔ جہاں دنیا بھر کی اجناس مل جاتی ہیں۔ اس کے چوک کا البتہ مہربانوں نے۔۔ چاندنی چوک۔۔ نام رکھ چھوڑا ہے۔ یہاں ایک سینما ہال میں اردو، ہندی فلمیں بھی لگتی ہیں۔ اور نہ صرف سینما میں بلکہ ہفتہ وار ٹی وی پر بھی فلم دکھائی جاتی ہے۔ بہر حال یہ مکس کلچر سٹریٹ بہت پسند آئی۔

اقبال فوڈ

پورے ٹورنٹو میں یہ پاکستانی سٹور بہت مشہور ہے اتنا کہ اس پر سب پاکستانی ناز کر سکتے ہیں۔

کیونکہ ٹورنٹو میں پاکستانی جاب لینے ٹیکسی چلانے کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں بجائے رسک لینے کو۔ اس لیے بزنس کی طرف ان کا رجحان برائے نام ہے۔ پاکستانی دوکانیں بہت ہی کم نظر آتی ہیں۔ اور ایسے میں کسی اچھے خاصے بڑے سٹور کا ہونا اور اس کا چلنا اور دور دور تک اس کا نام ہونا ایک بڑی خوشی کی بات ہے۔ اس لیے ٹورنٹو کے گردونواح کے شہروں تک میں بھی لوگ اسے جانتے ہیں اور کبھی کبھی وہ دوست احباب کو ملنے آئیں تو ایک چکر اس سٹور کا بھی ان کا لگ جاتا ہے۔ اس سٹور کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں بآسانی حلال گوشت مل جاتا ہے۔ ایک چکر ہمارا یہاں بھی لگا تھا۔ یہ اتنا بڑا ہے کہ ہر طرح کی شاپنگ یہاں ہو سکتی ہے۔ اگر انگلینڈ میں ہوتا تو شائد احباب اسے۔۔ کیش اینڈ کیری۔۔ اور گروسری شاپ کا سنگم قرار دے دیتے۔ ایک طرف تازہ پھل سبزیاں کھانے پینے کی اشیاء ہیں، پھر پاکستانی مٹھائیاں اپنی طرف خوب متوجہ کرتی ہیں۔ اور ایک حصے میں صرف حلال گوشت، قیمہ، چانپیں، مرغی پائے وغیرہ کا سلسلہ ہے۔ اکثر پوری فیملی یہاں خریداری کے لیے آتی ہے۔ خواتین پورے سٹور میں گھومتی پھرتی رہتی ہیں اور اپنی مرضی سے چیزیں لے کر ٹرالی بھرتی جاتی ہیں۔ بچے پورے سٹور میں بھاگتے دندناتے شور مچاتے نظر آتے ہیں اور مرد حضرات کی ڈیوٹی ہوتی ہے حلال گوشت والے سیکشن میں جا کر ان معاملات سے نپٹنے کی۔ اور فلم کے اینڈ کی طرح آخر میں سب پے منٹ کاؤنٹر پر مل جاتے ہیں۔۔۔

اقبال فوڈ پر ہر وقت ایک رش کا سماں رہتا ہے۔ جو کم ہونے کی بجائے بڑھتا ہی رہتا ہے۔ چند ایک فیملیز

نے بتایا کہ ان کی مین گروسری اسی سٹور سے ہوتی ہے۔ جو مہینے میں دو بار تک کر لی جاتی ہے۔ اور اس میں برکت بھی رہتی ہے۔ باقی چھوٹی موٹی روزمرہ کی شاپنگ جیسے دودھ، بریڈ، انڈے، سبزی، پھل وغیرہ وہ اپنے قریبی سٹور نو فرلز اور فوڈ بیسک وغیرہ سے لے لیتے ہیں۔ ہم نے بھی یہاں سے اپنی پسند کی اشیاء لیں۔ مٹھائی دیکھ کر تو دل خوش ہو گیا۔ مکس مٹھائی، لڈو، گلاب جامن، برفی، چم چم، بلکہ اپنی حد میں اتنی مٹھائیاں دیکھ حلوائی کی دوکان ہی یاد آ گئی۔ اور یہاں تو مٹھائی کے ساتھ ساتھ رس ملائی، گاجر کا حلوہ، کے پیکٹ بھی نظر آئے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ باقی سب کچھ ہم نے اوکے کر دیا لیکن وہ گوری چٹی رس ملائی دل کو نہ بھائی۔ جبکہ احباب اس کی تعریف میں اتنے رتب للسان رہتے تھے۔ کہ ہم اپنی ذائقے کی حس پر مشکوک ہو چلے تھے۔ ویسے اپنے قیام کے دوران ہم نے لوگوں کو ایک دوسرے کو رس ملائی اور گول گپے کے پیکٹ بھی تحفے میں دیتے ہوئے دیکھا تھا تو کچھ اچنبھے میں پڑ گئے تھے کہ شائد یہاں پھولوں کی کچھ کمی ہے۔۔

اقبال فوڈ پر اپنی پسند کے کچھ میگزین بھی لیے اور دل میں ان کا اقبال مزید بلند ہونے کی دعا کرتے ہوئے ہم سٹور سے باہر آ گئے۔۔

مہنگائی اور لوگ

کینیڈا کی تاریخ پر نظر ڈالتے ڈالتے ابھی میں نے ۔۔دو ہزار سات ۔۔میں ہوئے کینیڈا ٹورنٹو ٹرپ بارے اپنی کچھ یادداشتیں ترتیب دیں۔۔۔

مہنگائی مجھے کینیڈا میں بھی محسوس ہوئی۔شائد اس کا اور لوگوں کا ہمیشہ سے ساتھ ہے۔ویسے ہم ان لوگوں میں نہیں آتے کہ رہیں تو جرمنی میں اور خرچ کی رقم کو پاکستانی روپے میں بدل کر دل کو ہولاتے رہیں اور دن بدن کنجوسی کی اور بڑھتے رہیں۔اور اپنے دل کی معصوم خواہشات کو مارتے رہیں ،مارتے رہیں اور آخر ایک دن ہمارا دل خواہش کرنا ہی چھوڑ دے۔۔ویسے فضول خرچی کے بھی ہم قطعا قائل نہیں کہ وہ اللہ تعالی کو پسند نہیں۔مہنگائی کینیڈا میں بھی محسوس ہوئی۔اور کھانے پینے کی اشیاء میں کافی نظر آئی۔اس لیے یورو دے کر ڈالر کا سودا کرنا کچھ زیادہ بھایا نہیں۔اور مہنگائی پر ہم اکثر بات کر دیتے۔کچھ اور فیملی والے لوگوں سے اس پر بات بھی ہوتی رہی۔کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ ہاں مہنگائی تو ہے۔ملٹی نیشنل لوگوں کے لیے بھانت بھانت کی چیزیں دنیا بھر سے منگوائی جاتی ہیں۔اس وجہ سے بھی ،لیکن اس کے بغیر گزارا بھی نہیں ہوتا۔جبکہ کچھ مرد حضرات کا کہنا تھا کہ اگر آمدنی معقول ہے تو پھر مہنگائی اتنی محسوس نہیں ہوتی۔اور دوسرا اتنے سالوں سے یہاں ہیں تو اب عادت بھی ہو گئی ہے۔اور مہنگائی تو ہر جگہ ہی ہوتی ہے۔پاکستان میں کتنی مہنگائی ہے۔پھر مہنگائی کی تان ادھر ٹوٹنے لگتی۔ بلکہ لوگ تو شکر کرتے بھی نظر آئے۔کہ یہ کیا کم ہے کہ ہم کینیڈا میں ہیں۔پاکستان کے حالات میں تو نارمل زندگی جینا ہی مشکل ہے۔ جان سلامت نہیں ،عزت مال و دولت محفوظ نہیں۔پھر یہاں سے بات پاکستان کی ملکی سیاست اور

اور منسٹروں تک پہنچ جاتی۔ اور ہمیں بات کو پھر کھینچ کر مہنگائی کے دائرے میں لانا پڑتا۔ لوگ کہتے، مہنگائی کا مقابلہ کرنے کے لیے ہی بیشتر فیملی ممبر کام کرتے ہیں۔ وہاں میں نے اچھی بات یہ دیکھی کہ ادھیڑ عمر کی عورتیں بھی اپنے مطلب کے کام ڈھونڈ لیتی ہیں۔ بے بی سٹنگ کر لی۔ کسی کپڑے سینے والی فیکٹری میں کام کرلیا۔ گھروں میں بیٹھے ناشتے، کھانے بنا کر سپلائی کر دیتی ہیں۔ میزبان کے ایک دوست نے بتایا کہ اس نے اخبار میں اشتہار پڑھا کہ۔۔ دل مت ترسایئے اور اتوار کو حلوہ پوری چنے کا ناشتہ کیجیے۔ اور اس پتے پر حاصل کیجیے۔۔ نیچے فون نمبر لکھا تھا۔ وہ یہ پڑھ کر بہت خوش ہوا کہ پردیس میں دیس بننے جا رہا ہے۔ وہ فون پہ معلومات لے کر جب اس پتے پر پہنچا تو وہ اسی کی بلڈنگ کے کسی اپارٹمنٹ کا ایڈریس تھا۔ بلکہ سچ بات تو یہ ہے کہ کینیڈا پہنچ کر کوئی بھی فارغ نہیں بیٹھنا چاہتا۔ کیونکہ لوگ جلد سے جلد اس ٹارگٹ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ جسے ۔۔ اپنا گھر۔۔ کہتے ہیں۔ اس لیے میں نے کئی ایسی عورتیں بھی دیکھیں، جنہوں نے پہلے اپارٹمنٹ میں رہ کر گزارا کیا، فیکٹریوں میں کام کیے۔، سیونگ کی لیکن آج وہ اپنے گھروں میں آسودہ حال بیٹھی ہیں۔ اک سکون اور اطمینان کی کیفیت اب ان کے چہرے پر دیکھی جا سکتی ہے۔ میں ایک ایسی دوست، رشتہ دار کو جانتی ہوں۔ جن کی والدہ نے اتنے سال لگا کر اس کا پاکستان میں جہیز تیار کیا تھا۔ لیکن اچانک اس کے بھائی نے اسے کینیڈا بلا لیا۔ اور اس نے کینیڈا میں کام کر کے ایک سال میں اپنا جہیز خود تیار کرلیا تھا۔ اور یہ ثابت کر دیا تھا کہ اگر پاکستانی صنف نازک کو موقع دیا جائے تو وہ بخوبی اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکتی ہے۔ اور کسی پر بوجھ بننے کی بجائے اپنی ذمہ داری خود اٹھا سکتی ہے۔۔

اکثر ہائی بلڈنگ میں رہنے والوں کو بجلی پانی فری کی سہولت مل جاتی ہے۔ اور جو لوگ اپنے گھروں میں

رہتے ہیں۔انھیں پانی بجلی کچھاور معاملات کی طرف سے ذرا کنٹرولنگ اور احتیاط کرنی پڑتی ہے۔تو جن گھروں میں بجلی فری تھی، میں نے انھیں کچھ ٹپس بھی نوازے کہ وہ اس کا فائدہ اٹھا سکیں۔جیسے وہ دہی گھر بنالیا کریں۔بریڈ میکر لے لیں اور بریڈ گھر پر بنایا کریں۔۔

کینیڈا میں شاپنگ کرتے ہوئے بندے کوایک اچھا خاصا جھٹکا بھی لگتا ہے۔جب کاونٹر پر چیز کی قیمت کے علاوہ اس پر مزید ٹیکس پڑ جاتا ہے۔اور آپکا کیا حساب کتاب فرق ہو جاتا ہے۔جرمنی میں ایسا سلسلہ نہیں۔چیز کی قیمت کے اندر ہی ٹیکس بھی شامل ہوتا ہے۔اس لیے بندہ بار بار شاک لگنے سے بچ جاتا ہے۔ہر ملک کی طرح یہاں بھی سستے، مہنگے ہر طرح کے سٹور ہیں۔تو سہولت بھی ہے کہ ہر کوئی اپنی جیب کے مطابق خریداری کر لیتا ہے۔کچھ لوگ اگر چلڈرن پلیس سے بچوں کے لیے کپڑے لے لیتے ہیں تو کچھ لوگ مہنگے سٹوروں سے یہ شاپنگ کرتے ہیں۔اور اپنے بچوں کو دوسروں سے علیحدہ، منفرد پہناوے میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔اور یہ پرکشش سیل تو امریکہ میں بھی لگتی رہتی ہے تو ٹورنٹو اور اس کے گردونواح کے شہروں کے لوگ جھٹ نیاگرہ سے بارڈر کراس کر کے امریکہ سے شاپنگ کر کے آجاتے ہیں۔اور یہاں کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہونے دیتے۔ویسے اچھا کھانے، اچھا پہننے اور اچھا رہنے کی دوڑ میں تو ہر کوئی شامل ہے۔ویک اینڈ سے پہلے ہی اخباروں میں اگلے دنوں آنے والی سیل کے اشتہار آنے لگتے ہیں۔اور لوگوں کی اکثریت شوق سے اخباروں میں دیکھتی اور اپنے مطلب کی چیز نوٹ کر لیتی ہے، اور ویک اینڈ پر پوری فیملی اس جگہ پہنچ جاتی ہے۔بڑے بڑے سٹوروں کے اندر بھی مکڈونلڈ وغیرہ موجود ہوتے ہیں۔سو بچے بھی اسی لالچ میں شوق سے شاپنگ کرنے والدین کے ساتھ چلے آتے ہیں۔ یہاں بازار ساتوں دن کھلے رہتے ہیں۔اس لیے ہفتہ، اتوار کے دنوں تو بازار اور بھی بھرے ہوئے ملتے

ہیں۔لوگ گروسری کی چیزوں کی شاپنگ تو مہینے میں ایک یا دو بار کرتے ہیں۔لیکن باقی چیزوں کی خریداری درمیان میں موقع ملتے کرتے ہی رہتے ہیں۔رات دیر تک باہر سٹور بھی کھلے رہتے ہیں۔ جس کی بدولت روڈ پر ٹریفک بھی موجود رہتی ہے۔اک رونق کا سا ساماں نظر آتا ہے۔اور جو لوگ گروسری کے لیے نہ نکلیں وہ کھانا کھانے کے لیے ریسٹورنٹ کا رخ کرتے ہیں۔سو زندگی رواں رہتی ہے۔۔
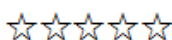
بس اور ٹرین

جہاز کی سواری کے بعد کینیڈا کی بس اور ٹرین میں سفر کرنے کا موقع بھی ملا۔ جبکہ میز بانوں کی ہمیشہ کوشش رہتی تھی کہ ہر وقت ہمیں اپنی چمچماتی گاڑی میں ہی گھمائیں۔ اور ادھر ہمارے دل میں از حد خواہش تھی کہ یہاں کی بس اور ٹرین کا دیدار اور سفر بھی لازمی کیا جائے۔ کیا فائدہ اتنی دور آنے کا، اگر دل میں کچھ حسرتیں دبا کر باقی لے جائیں۔ اور پھر ہم تو اپنے دل کی کرنے آئے تھے کہ بھئی یہاں کی سواری کے مزے لے کر ہی جائیں گے۔ تا کہ جرمن والوں کو جا کر کچھ تو بتا سکیں۔ اور جو یادیں بچ جائیں گی وہ پاکستان لے جائیں گے۔ سو یہ موقع موجودہ ٹرپ میں تو نہیں مل سکا۔ البتہ پچھلی بار جولائی اگست میں موسم کا تقاضا تھا کہ ہم اپنے دل کے ارمان پورے کریں۔ سو دو چار بار بس کا سفر کیا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا جرمنی کی بس میں نظر آتا ہے۔ وہی بس کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ایک آدمی جسے بیک وقت بس بھی چلانی ہے۔ پیسے بھی گننے ہیں ٹکٹ دینے ہیں اور بس میں چڑھنے والوں کو اپنا اچھا برا موڈ بھی دکھانا ہے۔ رنگ رنگیلے لوگ بس میں نظر آتے۔ بسیں بھی اچھی خاصی اور لشکارے مارتی ہوتیں۔ اور جو چیز دیکھ کر ہم ہکا بکا رہ گئے۔ اور ہمیں خود کو چٹکی کاٹنا پڑی۔ وہ سٹاپ پر بس روکنے کے لیے گھنٹی کا انتظام تھا۔ پوری بس میں چاروں طرف ایک تار پھیلائی ہوئی تھی۔ اور گھنٹی کہیں اوپر چھت کے قریب لگی تھی۔ سو جس نے بھی سٹاپ پر اترنا ہے اسے بس رسی نما تار کو کھینچنا ہے۔ اور ٹن سے اس سریلی گھنٹی نے بجنا ہے۔ سو یہ انوکھی۔۔۔ ٹن ٹن۔۔۔ بجنے کا سلسلہ دیکھ کر ہم کافی حیران تھے۔ جیسے زمانہ ماضی میں پہنچ گئے ہیں۔ کیونکہ یہ نظام ہم نے نہ تو یورپ میں دیکھا تھا۔ اور انگلینڈ میں بھی نہیں، جو بس پہ بس چڑھا کے چلتے ہیں اور وطن عزیز میں تو بالکل نہیں۔ جہاں ایک وسل سے کام چل جاتا ہے، وہاں اتنی لمبی الگنی باندھنے کا فائدہ؟

ہم نے میزبان کی طرف رجوع کرنا چاہا کہ شائد وہ ہی ہمیں زمانے کا چلن سمجھا سکیں ،ہماری کچھ رہنمائی کر سکیں لیکن وہ آرام سے ایسے بیٹھی تھیں جیسے صدیوں سے یہ نظام چلا آرہا ہو۔لیکن ہم جتنی بار بھی بس میں بیٹھے۔وہ تار دیکھ کر ہمیں پاکستان کی الگنی یاد آ جاتی۔اور ہم پر تجسس ہی رہے کہ شائد کسی بس میں ہمیں جدید نظام نظر آ جائے۔لیکن ایسا نہ ہوا۔اور لوگ اس رسی نما گھنٹی کو بڑے سٹائل سے کھینچ لیتے۔تو ہم نے سوچا کہ جب وہ لوگ اس سسٹم کو دل سے لگائے ہیں تو ہم کاہے کو غم کھا رہے ہیں۔جب گھنٹی بجانے والا بھی خوش اور سننے والا بھی خوش تو پھر غم کاہے کا،لیکن دل میں شکر کیا کہ یہ سسٹم پاکستان میں نہیں ورنہ وہاں تو لوگ اس سے بھی زیادہ فائدہ اٹھا لیتے اور بس میں کپڑے سکھاتے نظر آتے۔واقعی اللہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے اس کے بعد اس سے ملتی جلتی ایک اور چیز دیکھی۔ٹورنٹو کے کچھ علاقوں میں بجلی کا سسٹم ایسا تھا جیسے پاکستان میں بجلی کے تار اور کھمبے سڑک کی رونق بنے ہوتے ہیں۔یہاں بھی ایسا ہی سین دیکھنے میں آیا اور ان پر کبوتر بیٹھے دیکھ کر تو سماں رنگین ہو گیا۔کیا ہوا اگر ان تاروں پر بیٹھنے کے لیے کوے نہیں ،چڑیاں نہیں۔۔کم سے کم ہر طرف اڑتے سفید سفید کبوتر ،کبوتریاں تو ہیں نا۔۔بس منظر دلکش ہونا چاہیئے لیکن یہ بات کچھ اچنبھے کی لگی کہ دیسی تو دیسی کیا گوروں نے بھی اس طرف توجہ نہیں کی۔۔کیا یہ ضروری تھا کہ جو قوم بھی یہاں اٹھ آئے وہ آتے ہوئے ساتھ اپنا تھوڑا سامان بھی اٹھا لائے۔۔اس کے بعد ہم کینیڈا کی سب وے میں جا بیٹھے۔بالکل ویسا ہی لگا جیسے انگلینڈ کی سب وے میں لگتا ہے یہاں کی ٹرین بھی اچھی ہے۔لیکن ایک بار ہم ایک ایسی ٹرین میں جا بیٹھے۔جو دو ٹرینوں کے درمیانی فاصلے کے درمیان چلتی ہے۔اس ٹرین نے ہمیں پاکستان کی پسنجر ٹرین کی یاد دلا دی۔چھک چھک چھکا چھک کرتی اس ٹرین نے ہمیں کافی زوردار جھٹکے بھی دیئے جو کہ ہم اس سے بالکل امید نہیں کر رہے تھے۔۔۔

دل کے ارماں

ویسے تو کینیڈا میں رہنے والے اپنے کھانے پینے کے ارمان آسانی سے پورے کر سکتے ہیں۔ من پسند کھا سکتے ہیں، پہن سکتے ہیں، سیر سپاٹا کر سکتے ہیں۔ فلم دیکھ سکتے ہیں۔ لائبریری جا سکتے ہیں۔ بلکہ مجھے یہاں کا لائف سٹائل کچھ پاکستان کے قریب لگا۔ جب دل چاہا باہر سے سموسے، جلیبیاں، دہی بڑے، رس ملائی اس طرح کی چیزیں آ رہی ہیں اور مہمان کی آمد کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ اچانک کے آئے مہمان کے لیے بڑے آرام سے کھانا باہر ریسٹورنٹ سے آرڈر کر لیا جاتا ہے۔ اس لیے خاتون خانہ کو کوئی پریشانی نہیں۔ بلکہ ایک دن کچھ مہمان آنے والے تھے۔ وقت کے حساب سے ان کے لیے چائے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مہمان لیٹ ہو گئے اور وہ کھانے کے وقت پہنچ پائے۔ تو بغیر کسی کوفت کے باہر ریسٹورنٹ سے کھانا۔۔ نہاری، تکہ کباب، چکن بریانی، سیخ کباب، نان اور گاجر کا حلوہ آرڈر کر لیے گئے۔ پزا، چائنیز فوڈ تو لوگ بڑے آرام سے گھر آرڈر کر لیتے ہیں، کام سے واپسی پر گھر لے آتے ہیں۔

میرا خیال ہے یہاں کھانے کے معاملات کو لے کر میاں بیوی میں اتنے جھگڑے نہیں ہوتے۔

صاحب خانہ فون پہ پہلے ہی پوچھ لیتا ہے کہ،

:اے زہرہ جبیں، آج کیا پکا ہے۔؟:

اور مینو پسند نہ آئے تو اس کے پاس بھی آپشن موجود رہتا ہے۔

:اونہہ، اگر بیوی بچے گھاس پھونس کھا کر خوش ہیں تو شوق سے کھائیں۔:

وہ اپنے لیے مٹن، چکن کا بندوبست کر لیتا ہے۔

☆☆☆☆☆

لائف سٹائل

ٹورنٹو میں ایک خاص بات یہ بھی دیکھی کہ وقت نہ ہوتے ہوئے پھر بھی وقت نکال کر لوگ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ کافی سوشل ہیں، ملنسار ہیں۔ اور آئے دن وہاں گیدرنگ ہوتی ہے۔ لوگ آپس میں رابطے سے ہوتے ہیں۔ اتوار کو اکثر احباب ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ بس جیسے مل بیٹھنے کا بہانہ چاہیے۔ خواتین کی اپنی پارٹیز، ون ڈش پارٹی، گرلز گیٹ ٹو گیدر، بے بی شاور۔۔ پاکستان یا کسی اور ملک سے آئے مہمان کو سب ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ اسی کے طفیل سب دوست احباب کے بھی مزے رہتے ہیں۔ اس کی خاطر و مدارت کے لیے گھروں اور ریسٹورنٹ میں دعوتوں کا خوب سلسلہ چلتا ہے۔ مہمان بے چارا دعوتیں کھا کھا کر شرمندہ سا ہوتا رہتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ میری وجہ سے سب اپنے کام دھام چھوڑ کر اکٹھے ہو رہے ہیں۔ لیکن کچھ دعوتوں کے بعد اسے خود ہی اندازا ہو جاتا ہے کہ یہ یہاں کا لائف سٹائل ہے، پھر وہ بھی کچھ بے فکرا سا ہو جاتا ہے۔ سو ایک گروپ کی صورت اسے خوب گھمایا پھرایا جاتا ہے۔ اس کی عزت افزائی کی جاتی ہے، یوں مہمان آخر کار ایک دن انھی خوشگوار یادوں کے ساتھ واپسی کی اڑان بھر لیتا ہے۔ اور سوچتا ہے کہ کون کہتا ہے کہ آج کے دور میں کسی کے پاس کسی کے لیے وقت نہیں۔ ملٹی نیشنل لوگوں کے آئے دن رنگ برنگے مہمان بھی ان کے ملکوں سے آتے رہتے ہیں۔ کافی کو وزٹ ویزا آسانی سے مل جاتا ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کو نہیں بھی ملتا، جس پر ان کے احباب کافی اداس اور امیگریشن والوں سے نالاں نظر آتے ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ باقی سب کو وزٹ ویزے مل جاتے ہیں، بس ہمارے ساتھ ہی ایسا کیا گیا ہے۔ جبکہ ہم نے یہ دیکھا کہ پاکستان اور دوسرے ملکوں سے لوگ پھر بھی بآسانی کینیڈا پہنچ جاتے ہیں۔ اور انگلینڈ تک آئے لوگوں کو جرمنی تک کا ویزا نہیں ملتا۔ اور ہمارا

تو یہ بھی ماننا ہے کہ ویزا ابھی اک لاٹری کی صورت ہے۔ کبھی کسی کی لگ گئی اور کبھی کسی کی۔۔ پر یہ لاٹری نکالنے والے بھی ہوتے ہیں بڑے کائیاں ۔۔اچھی بات یہ ہے کہ انگلینڈ کی طرح کینیڈا میں بھی لوگ بیک وقت دو نیشنیلٹی رکھ سکتے ہیں۔ جبکہ جرمنی میں ایسا نہیں ہے اور بندے کو آخر فیصلہ کرنا ہی پڑتا ہے کہ وہ کونسی نیشنیلٹی رکھے اور کونسی چھوڑے۔ خاصا مشکل مرحلہ اس کے سامنے آجاتا ہے۔ اگر محبِّ وطن بن کر پاکستانی پاس رکھتا ہے تو جرمن کے کئی حقوق سے بندہ باہر ہو جاتا ہے اور اگر جرمن پاس لے لیتا ہے تو اپنا وطن اجنبی سا نظر آنے لگتا ہے۔ اسی لیے یہ فیصلہ کرتے کرتے لوگ کئی سال لگا دیتے ہیں۔ بھئی آخر فیصلہ جو ہوا۔۔ مختلف لوگوں کی طرف سے مختلف فیصلے سامنے آتے ہیں۔ اس لیے اکثر ایک فیملی کے ممبران بھی مختلف نیشنل پاس کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اور اس کا واضح فرق تب دیکھنے میں آتا ہے، جب اپنے ملکوں جا کر کچھ لوگ امیگریشن سے فارغ ہو کر جلد باہر نکل آتے ہیں۔ اور کچھ تا دیر لائن میں پھنسے رہتے ہیں۔ اکثر پوری فیملی باہر انتظار کر رہی ہوتی ہے اور ابا ابھی لائن میں لگے ہوتے ہیں۔۔

کینیڈا میں بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جو یورپ بارے جاننا چاہتے ہیں۔ اور اکثر لوگ اپنی چھٹیاں منانے کے لیے امریکہ کے علاوہ یورپ کا بھی رخ کرتے ہیں۔ پیرس، سوئٹزر لینڈ، ہالینڈ، اٹلی، انگلینڈ، ڈنمارک دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں اور موقع ملنے پر اسے پوری کرتے ہیں۔ یہ جان کر ہمیں کافی حیرانی ہوئی کہ کینیڈا کے ایک شہر کا نام بھی۔۔ لندن۔۔ ہے۔ کینیڈا سے پاکستان جانا بھی اک مشکل مرحلہ ہے۔ اک لمبی لگاتار سولہ گھنٹے کی مسافت۔۔ اور پھر اتنا ہی مہنگا ٹکٹ، فیملی کے ساتھ جانا ہو تو کافی مہنگا سلسلہ ہے۔ لیکن پھر بھی بہت سے لوگ اپنے ملکوں جاتے آتے ہیں۔ کیونکہ روپیہ پیسہ ایک طرف اور اپنے پیاروں کی محبت ایک طرف۔۔۔

انٹاریو

انٹاریو کا پہلا تعارف تو یہی ہے کہ یہ کینیڈا کا ایک صوبہ ہے۔ جو دنیا میں متعارف ٹورنٹو جیسے مشہور شہر کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ ٹورنٹو سے جب بھی کبھی کوئی پوسٹ آتی یا کارڈ آتا تو اس پر ایڈریس میں ہمیشہ ٹورنٹو کے ساتھ انٹاریو بھی لکھا ہوتا اور ہم بھی ادھر سے انھیں عرض حال بتانے کے لیے لکھتے تو ہمیں بھی انٹاریو لکھنا پڑتا اور سوچ میں پڑ جاتے کہ کیا صوبے کے نام کے بغیر انھیں پوسٹ نہیں ملے گی۔ لیکن جب کینیڈا کی طرف سفر کیا تو دیکھا کہ منزل کے قریب پہنچنے سے پہلے کسٹم والوں کے لیے جو کارڈ ملتا۔ تو اس میں بھی اس کا نام لازم لکھنا پڑتا۔ پھر وہاں پہنچ کر جو سائنس سینٹر دیکھا تو اس کا نام بھی ۔۔ انٹاریو سائنس سینٹر ۔۔ تھا۔ اور میزبان بھی دور دراز علاقوں سے آنے والے احباب کو کچھ یوں ایڈریس سمجھاتے دیکھنا کہ ادھر سے دائیں مڑ جانا، پھر لنک روڈ لینا تو سیدھا انٹاریو سائنس سنٹر کے پاس پہنچ جائیں گے۔ وہاں سے آگے ۔۔ پھر اور آگے ۔۔،

انٹاریو، انٹاریو، انٹاریو ۔۔ یہ اتنی بار سننا پڑتا کہ ٹورنٹو کے بعد یہ ہمارے ذہن میں جیسے فکس ہو گیا۔ اپنے آپ کو یقین دلانا پڑتا کہ ہم گو ٹورنٹو میں ہیں لیکن اس کی زمین آخر حکومت نے انٹاریو کو دی ہے۔ اور کہیں بھی جائیں تو ہم ایسے ہی کسی کے گھر میں نہیں چلے جاتے۔ جب تک میزبان اور ان کے گھر بارے خاطر خواہ انفارمیشن ہمارے پاس نہ ہو۔ تو انٹاریو بارے جاننا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ کیا ہے؟ آبادی کے لحاظ سے یہ کینیڈا کا سب سے بڑا صوبہ ہے، جو رقبے کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر آتا ہے۔ کیوبک پہلے نمبر پر ہے۔ اس کی سرحدیں، مینی ٹوبہ، کیوبک اور امریکن ریاستوں مشی گن، نیویارک اور منی سوٹا سے ملتی ہیں۔ امریکہ سے ملنے والی انٹاریو کی سرحد زیادہ تر قدرتی ہے۔ اور یہ لیک آف وڈز

سے شروع ہوتی ہے اور چار عظیم جھیلوں۔۔سپیریئر لیک، ہرون، ایری اور انٹاریو سے ہوتی ہوئی گزرتی ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اونٹاریو کا نام اسی جھیل کے نام سے اونٹاریو کا نام رکھا گیا ہے۔یہ ایک مقامی زبان کا لفظ ہے، جس کا مطلب۔۔عظیم پانی۔۔ہے۔اور پھر یہ سرحد لارنس کے دریا کے ساتھ چلتی ہے۔

اونٹاریو کینیڈا کا وہ واحد صوبہ ہے جو ان چار عظیم جھیلوں سے ملا ہوا ہے۔اس کا دارالخلافہ ٹورنٹو ہے۔ اور ٹورنٹو کینیڈا کا سب سے بڑا شہر ہے۔اور کینیڈا کا دارالحکومت اٹاوا بھی اسی صوبے میں واقع ہے۔اس علاقے میں گرم اور مرطوب گرمیاں اور سردی کا موسم سرد ہوتا ہے۔خزاں اور بہار کا موسم معتدل ہوتا ہے اور بارشیں سارا سال ہوتی رہتی ہیں۔

یہاں کی معاشی سرگرمیوں میں بینک کاری کا یہ مرکز ہے۔

پیئرسن کا نیشنل ہوائی اڈا، ملک کا مصروف ترین اور دنیا کا انتیسواں مصروف ترین ہوائی اڈا ہے۔ یہ سالانہ تین کروڑ مسافروں کو سنبھالتا ہے۔ریل کے رابطے میں۔۔ایم ٹریک۔۔اونٹاریو کو نیویارک اور امریکہ کے کئی اور شہروں سے ملاتی ہے۔

زراعت جو کبھی یہاں کی معشیت کا بہت بڑا حصہ ہوا کرتی تھی۔اب آبادی کا بہت کم حصہ اس سے وابستہ ہے۔

اونٹاریو کے دریا بشمول نیاگرا کا دریا، اس صوبے میں پن بجلی پیدا کرنے کے لیے اہم ہیں۔

دوسرے علاقوں سے زیادہ سیاحت یہاں کی معشیت میں اپنا ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔اور سیاحت کا زیادہ زور گرمیوں کے موسم میں رہتا ہے۔

☆☆☆☆☆

انداز اپنا اپنا

زندگی کے معاملات ہر جگہ اپنا رنگ انوکھے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ جرمنی میں لوگ ایک دوسرے سے ملیں یا کسی کے گھر جائیں تو اولین پھول لے جانے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس سے بڑھ کر بھلا محبت، خلوص کی اور کیا زباں ہو گی۔ جبکہ کینیڈا میں لوگ کیک لے جاتے ہیں۔ اسٹرابری کیک، چاکلیٹ کیک اور چیز کیک سب سے زیادہ چوائس میں ہے۔ حالانکہ کیک اچھے خاصے مہنگے بھی ہوتے ہیں اور پھول وہ صرف ہوسپٹل میں مریض کے لیے لے کر جاتے ہیں۔ ہاں بھئی اپنا اپنا ریت رواج۔۔ یقیناً انھیں مریض کے لیے محبت کی زباں زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہو گی۔ کیا پتہ اپنے اردگرد پھولوں کی رنگینی دیکھ کر اور خوشبو سونگھ کر وہ کافی بہتر محسوس کرتا ہو گا۔۔

شادیاں کینیڈا میں بھی ٹھیک ٹھاک ہو جاتی ہیں اور بآسانی ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ شادی سے متعلق جملہ معاملات یہاں بھی سہولت سے نپٹ جاتے ہیں۔ میرج حال میں بخوبی یہ فنکشن ہو جاتے ہیں۔ جیسے ایک ریسٹورنٹ حویلی بارے بھی بتایا تھا کہ وہ بینکوئٹ ہال بھی ہے۔ اور کھانے کا بندوبست بھی انھی کے ذمے ہوتا ہے۔ اس لیے لوگ یہ نہیں سوچتے کہ پاکستان جا کر شادی کریں گے۔ کیونکہ بیشتر فیملی کے عزیز، اقرباء، دوست احباب زیادہ یہیں ہوتے ہیں۔ تو وہ پھر شادی کرنے کو یہیں ترجیح دیتے ہیں۔ جبکہ کچھ لوگ شادی اگر پاکستان کرتے ہیں تو ایک آدھ ہلکا سا فنکشن یہاں بھی کر لیتے ہیں۔ اور یہاں کی سہولت سے بھی استفادہ کر لیتے ہیں۔ البتہ شادی کے لیے جیولری، ڈریسز وغیرہ کی تیاری پھر بھی لوگ پاکستان جا کر کرنا پسند کرتے ہیں۔ سو شادی سے پہلے ان کا ایک آدھ چکر اسی نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ شاپنگ کرنا یہاں ایک شوق کی طرح ہے۔ اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ الحمدللہ، یہاں کینیڈا میں سب کچھ

مل جاتا ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں۔ ویسے بات تو درست ہے، بس کچھ چیزیں کافی مہنگی ملتی ہیں۔ لیکن یہ غنیمت ہے کہ مل جاتی ہیں اور وقت ضرورت بندہ لے ہی لیتا ہے۔

اسی طرح ایک گیدرنگ میں ہم نے مہربانوں سے پوچھ ہی لیا، وہ بات جو بار رہا نوٹ کی تھی تو اب پوچھنے سے رہا نہیں گیا کہ،

: کچھ لوگ۔۔ کینیڈا۔۔ کہتے ہیں اور کچھ مہربان اسے۔۔ کنیڈا۔۔ کہتے ہیں۔ تو سب ہنس پڑے تھے۔

پھر بتایا کہ،

: پڑھے لکھے لوگ کینیڈا کہتے ہیں اور نا خواندہ لوگ کنیڈا کہتے ہیں۔ :

پھر ہمارے نالج میں مزید اضافہ کیا گیا،

: یہاں ایک اور شہر ہے جسے پڑھے لکھے۔۔ آٹوا۔۔ کہتے ہیں اور نا خواندا۔۔ اٹاوا۔۔ کہتے ہیں۔ :

یہ سب سن کر ہم مسکرا دیئے۔ اور دل میں پھلجڑی چھوٹی کہ شکر ہے مولا تو نے بچا لیا، ورنہ کسی موقعے ہمارے منہ سے۔۔ اٹاوا۔۔ نکل جاتا، تو مہربانوں نے تو ہمارا نام۔۔ نا خواندہ۔۔ میں درج کر دینا تھا۔ بھئی، اب اس میں بچارے بولنے والوں کا کیا قصور؟ اب دیکھیے نا اس۔۔ لفظ۔۔ کو، جسے ہم نے مختلف انداز میں لکھا دیکھا ہے۔ جیسے۔۔ ٹورنٹو۔۔ ٹرانٹو۔۔ ٹورانٹو۔۔ ترانتو۔۔،

☆☆☆☆☆

ادب اور ادبی لوگ

ٹورنٹو میں لوگ مختلف شوق پالے ہوئے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا شوق تو ہمیں اچھا کھانا پینا، سیر وتفریح اور گیدرنگ نظر آئی۔ وقت کی کمی کے باوجود ہر ویک اینڈ پر اک نیا پلان سب کا منتظر ہوتا ہے۔ کیونکہ اتوار کو بھی شاپنگ سٹور کھلے رہتے ہیں تو شاپنگ بھی کرتے ہیں۔ موسم کو انجوائے کرنے کے لیے کسی پارک کا رخ کرتے ہیں، گرمی ہو تو پانی کے قریب جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اتوار کو پورے ہفتے کی تھکن اتارنے کو لمبی تان کے سو جاتے ہوں۔ اگر کسی کا موڈ ہو بھی تو بھی باقی عزیز یا دوست وغیرہ گھر سے نکال لیتے ہیں۔ یوں ان کی زندگی کافی رونق والی ہے۔ یہ نہیں کہ دوست احباب عرصے بعد ملیں اور صورت نہ دیکھنے کے شکوے شکایت ہی کرتے رہیں۔ اور مثبت بات یہ بھی لگی کہ اس طرح سب اپنی اپنی کمیونٹی سے جڑے رہتے ہیں۔۔

ٹورنٹو میں لائبریری تو کافی ہیں۔ اور ان میں کتابوں کی کولیکشن بھی موجود ہے۔ لیکن پھر بھی ادبی خواتین وحضرات کا تناسب کم ہے۔ گو پڑھنے والے لوگ ہیں مگر کم ہیں۔ مجھے ایک خاتون ملی، جن سے ذرا ادبی قسم کی گفتگو ہوئی تو وہ بہت خوش تھی کہ مجھے کوئی تو ملا جس سے میں اپنے من پسند موضوع پر بات کر سکتی ہوں۔ اس نے بھی یہی بتایا کہ ہر ایریا میں لائبریری موجود ہے۔ لیکن پڑھنے والے لوگ کم ہیں۔ حالانکہ اگر سہولت نہ ہو تو لوگ فوراً اس کا اظہار کر دیتے ہیں۔ اور اب جب یہ ملی ہے تو لوگ اس کی پروا نہیں کر رہے۔ ان کی بات سے ہمیں بھی انکار نہ تھا۔ کوئی ہم سے پوچھتا؟ کہ جرمن لائبریری میں اردو کولیکشن کے نہ ہونے سے ہمیں کتنی کمی محسوس ہوتی ہے۔ دل بہلانے کے لیے کبھی انگلش اور کبھی جرمن کتاب لے لیتے ہیں۔ ہاں بھئی، جب من وسلویٰ کی پرواہ نہیں کی گئی، یہ تو پھر صرف کتابیں ہیں۔

مزید یہ بھی کہنا تھا کہ،

:خواتین مارننگ شو اور ڈرامے دیکھنے میں زیادہ وقت گزار دیتی ہیں ۔آجکل تو دیکھ لیں کہ ڈائجسٹ کی کہانیوں پر ہی ڈرامے بن رہے ہیں، جو ادب پڑھنے والے لوگ پہلے ہی پڑھ چکے ہیں ۔چلیں اچھی بات ہے اب انھی کہانیوں کو لوگ ڈرامے کی صورت دیکھ کر ان کے اچھا ہونے کی تائید تو کریں گے ۔پھر لوگ نیٹ پر بھی کافی وقت گزارتے ہیں ۔کتاب سے محبت کرنے والے ادبی لوگ ہیں لیکن ان کا ذرا کم تناسب ہے۔:

ایک روز ایک دعوت کے بعد دوست احباب کی محفل جمی ہوئی تھی ۔سب محو گفتگو تھے کہ ادبی گفتگو چل پڑی تو ایک صاحب نے بڑا پر لطف قصہ سنایا۔ کہ ایک جگہ محفل جمی ہوئی تھی ۔خوب شعر و شاعری ہو رہی تھی ۔تو میں نے بھی اپنی پسند کی غزل پڑھنا شروع کر دی۔غزل کچھ یوں تھی۔

دیارِ نور میں تیرہ شبوں کا ساتھی ہو

کوئی تو ہو جو میری وحشتوں کا ساتھی ہو

اور میں پہلے مصرعے میں۔۔تیرہ۔۔کو۔۔تیرا۔۔پڑھ رہا تھا۔اور اس مصرعے کو کئی بار دہرایا۔

دیارِ نور میں تیرا شبوں کا ساتھی ہو

پھر پوری غزل پڑھی۔اور دوبارہ پہلے مصرعے کو دہرانے لگا۔مزے کی بات یہ ہوئی کہ اسی محفل میں اس غزل کے شاعر بھی موجود تھے۔اور پورا وقت میرے غلط پڑھنے پر وہ مسکراتے رہے۔ یہ قصہ سن کر کچھ نے بے اختیار قہقہہ لگایا اور باقی سب ہنسنے لگے۔۔۔

☆☆☆☆☆

واک

میں ٹورنٹو میں قیام کے دوران بھی اپنی واک کی عادت چھوڑ نہ پائی ۔سیر وتفریح کا اپنی جگہ مزا تھا اور کبھی صبح کے وقت اور کبھی سہ پہر کو واک کے لیے جانے کا اپنا ہی لطف تھا۔باہر نکل کر فریش ہوا بہت اچھی لگتی ،دنیا کا اک ہنگامہ سا منے ہوتا ،پھر فطرت مجھے اپنی اور کھینچتی تو میں واقعی ایسے نظاروں کو مس نہیں کرنا چاہتی تھی ۔ بلکہ خوبصورتی کا اک اک لمحہ کشید کر لینا چاہتی تھی ۔جن دنوں وہاں جانا ہوا۔موسم خزاں شروع ہو چکا تھا۔سو درختوں سے پتے زمیں بوس ہو رہے تھے۔اور روڈ پر نظر آتے ۔ذرا سی بھی ہوا چلتی تو لگتا خوب شور مچا رہی ہے۔ہوا کے ساتھ اڑ کر پتے ادھر ادھر بکھر نے لگتے۔کبھی ان کا وجود قدموں کے نیچے آ جاتا۔واک کرتے کرتے اوپر نگاہ اٹھاتی تو اپنے وجود سے خالی ہوتے درخت مجھے اور ہی کہانی سناتے۔میرا دل افسردہ سا ہو جاتا۔کیا ہوا جو یہ بے جان ہیں لیکن بے زبانی کی بھی تو اک داستاں ہے،

اگلی بہار

ہوا تو دھیرے دھیرے چل

آہستہ آہستہ سبک خرامی سے

میرا وجود کمزور پڑ چکا ہے

بدن کا الاؤ سیاہ پڑنے لگا ہے

میرا تن من سجانے والے سرسبز پتے

خزاں کے خوف سے پیلے پڑ چکے ہیں

ذرا سی آہٹ سے ڈرنے لگتے ہیں

اپنے ساتھیوں کو حسرت سے دیکھتے ہیں

وچھوڑا دل کو ستانے لگتا ہے۔۔

جانے اب کس کے جانے کی باری ہے

یہ شان و عظمت اب زمیں بوس ہونے کو ہے

اور دنیا کی ٹھوکروں میں جا بسنے کو ہے

وہ ہرا بھرا مقابلہ ختم ہی سمجھو

اب انتظار کر۔۔

اگلی رت، اگلی بہار، اگلے وچھوڑے کا

☆☆☆

رنگولی

ایک دن میں واک کے لیے نکلی تو ایک جگہ سے گزرتے ہوئے ایک انوکھی چیز دیکھی تو رک گئی۔ ہندی فلم، ڈرامے میں تو یہ کئی بار دیکھی تھی لیکن حقیقت میں دیکھنے کا پہلا اتفاق ہو رہا تھا۔ چلو اچھا ہوا ہم نے کینیڈا میں ایک اور انوکھی چیز اپنی آنکھوں سے دیکھ لی اور اب احباب کو بتانے کے لیے بھی ایک اور پر لطف بات مل گئی تھی۔۔

یہ ایک دروازے کے آگے رنگوں سے بنی ہوئی تھی۔ ڈبے، بیل بوٹوں کا سا ڈیزائن، خوبصورت رنگوں سے مزین، جی ہاں۔۔ ایک گھر کے آگے۔۔ رنگولی۔۔ بنی ہوئی تھی۔ سری لنکا فیملی کا غالباً گھر تھا۔ رنگولی دیکھ کر قدم بے اختیار رک گئے۔ بے شک ہمارا اس سے کیا لینا دینا تھا۔ لیکن اس کے خوبصورت رنگوں اور جس مہارت سے وہ بنائی گئی تھی، اس نے میری پوری توجہ اپنی اور کھینچ لی تھی۔ اور کائنات کے رنگوں سے ہم غافل کیسے رہ سکتے تھے۔ پھر رنگولی کا لائیو نظارا مل رہا تھا۔ سو دو تین منٹ کھڑے ہو کر اس کے ڈیزائن اور رنگوں کو بغور دیکھا۔ بھئی آخر ہمارے دیکھنے کے لیے ہی گھر سے باہر وہ رنگولی بنائی گئی تھی۔ ورنہ ایسی بات نہ ہوتی تو پھر وہ اسے گھر کے اندر بنا لیتے۔۔

☆☆☆

چینی یا جاپانی

ایک روز واک کرتے ہوئے ایک چینی عورت ملی۔ ہیلو ہائے کے بعد بات آگے بڑھی۔
اس کے چہرے کے نقوش ذرا موٹے موٹے پھولے پھولے سے تھے۔ میں نے پوچھا
: کیا آپ جاپان سے ہیں۔؟:
تو وہ سن کر ہنسنے لگی اور کہا
: میں چائنا سے ہوں لیکن اکثر لوگ مجھے جاپانی سمجھتے ہیں۔ پلیز مجھے بتائیے کہ آپ کو میں جاپانی کیسے لگی ہوں آخر میرے اندر ایسی کیا چیز نظر آتی ہے کہ سب ایسا سمجھنے لگتے ہیں۔؟:
اب میں اس بارے کیا کہتی۔ دل میں سوچا تمہارے چہرے کے نقوش یہی چیخ چیخ کر بتاتے ہیں۔ پر میں نے ہنس کر بات ڈال دی۔ اس کے نقوش پر صاف گوئی سے بات کرنا مشکل تھا۔ پھر وہ میری قومیت پوچھنے لگی۔ پاکستان کا نام سن کر بہت خوش ہوئی۔ پھر اس نے بتایا کہ وہ چین کے کس شہر سے ہے۔ اس نے کہا میں چنگوئی سے ہوں چنگوئی، اس نے یہ نام کئی بار دہرایا لیکن میرے چہرے پر کوئی جانی پہچانی لہر نمودار نہ ہوئی۔ وہ بچاری چنگوئی، چنگوئی کرتی رہی۔ اور اگلے روز اچانک کام کے دوران مجھے یہی بات یاد آ گئی۔ اور ذہن نے یک دم کلک کیا۔ اور میں نے خود سے کہا، او مائی گاڈ، اس بیچاری نے کتنی بار بتایا۔۔ دراصل وہ شنگھائی کو چنگوئی چنگوئی کہہ رہی تھی۔ خیر ایک دو دن بعد وہ مجھے دوبارہ مل گئی۔ تب میں نے اس پر ایک شناسائی کی نظر ڈالی۔ پھر بات چیت ہوئی تب میں نے اسے بتایا کہ میں جان چکی ہوں کہ آپ شنگھائی سے ہیں نا۔ تب اس کا چہرہ یکدم کھل گیا۔۔

☆☆☆☆☆

ریت رواج

دنیا میں کہیں بھی چلے جاؤ، کلچر، رسومات وغیرہ سے پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا اور بندہ چھڑائے بھی کیوں۔؟ آخر یہی تو کسی بھی معاشرے کی پہچان ہے۔فرسودہ فرمودات میں انھیں ریت رواج کا نام دیا جاتا ہے اور جدت پسندی میں لائف اسٹائل کا۔۔۔

ٹورنٹو میں ہم نے ریسٹورنٹ میں دعوتیں کھائیں، پارٹیز ہوئیں، سیر و تفریح، پکنک بھی کیں اور کئی احباب نے اپنی سہولت کے حساب سے گھروں میں بھی مدعو کیا۔اور رشتے داروں کی طرف سے علیحدہ دعوتیں ہمیں اپنی اور بلاتی تھیں۔سو یہاں ہم نے مختلف طرح سے مہربانوں کی مہربانیوں کو آزمایا اور وہ اس پر کھرے اترے۔بس اگر کچھ تھوڑا فرق تھا تو وہ ڈالر کا تھا جیسے۔۔۔

ہم یورو کو دیکھتے ہیں تو ساتھ پاکستانی کرنسی بھی نظروں کے سامنے آنے لگتی ہے اور کبھی پونڈ اور ڈالر جھلک دکھلانے لگتے ہیں۔ہمیں آج تک اگر کسی نے مات دی ہے تو وہ پونڈ ہے۔کہ انگلینڈ میں جاتے ہی ہماری کرنسی سکڑنے لگتی اور ہر طرف آنکھوں کے سامنے پونڈ ناچنے لگتے، پنس لڈی ڈالنے لگتے اور اس کے ساتھ ساتھ ہم بھی نادم ہونے لگتے۔اور وہاں کچھ حد سے زیادہ مہنگائی لگنے لگتی۔حتیٰ کہ ان کے روزمرہ کی اشیائے خرید بھی بہت مہنگی لگتیں اور ہم ان کا جرمن کی اشیائے خرید سے مقابلہ کرنے لگتے اور نادانستگی میں مہربانوں کو بھی باور کرانے کی کوشش کرتے، کہ وہاں یہ چیزیں اتنے کی سستے میں ہیں اور یہ کہ ہم جرمن والے بھی خصوصیات کے مالک ہیں۔اور ویسے بھی ہم نے ہٹلر جیسی نامور اور نہ بھلانے والی ہستی رکھ چھوڑی ہے جس کا نام سن کر آج بھی لوگ کانپ جاتے ہیں۔اس لیے تم لوگ بھی ذرا ہم سے مرعوب ہو کر رہا کرو۔کیا ہوا جو ہمارے پاس ڈیانا نہیں تھی، ہٹلر تو تھا نا۔۔۔

اور جب پاکستان جاتے تو یہی پیسے ایک اچھی خاصی تعداد میں جب ہاتھ میں آتے تو پیسوں میں برکت کا احساس ہونے لگتا۔ کینیڈا کی طرف آئے تو یہاں کنیڈین ڈالر نے بھی ہماری عزت رکھ لی۔ ایک یورو دوے کر تقریباً ڈیڑھ ڈالر ہاتھ میں آرہا تھا، گو زیادہ تو نہیں بڑھے تھے اور ہم اسی میں خوش تھے کہ کسی خسارے سے تو بچ گئے ہیں کیونکہ خسارا برداشت کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ یہاں نقصان تب لگتا تھا جب سٹور میں کوئی چیز مناسب قیمت پر لگتی اور کاؤنٹر پر قیمت ادا کرتے ہوئے وہ کچھ اور ہی بن جاتی، اور ہماری ساری خوشی اور خوش فہمی پل بھر میں بہہ جاتی۔ وہ تو شکر ہے کہ ہم نے کینیڈا کی طرف زیادہ شاپنگ پلان نہیں کی۔ کہ کیا فائدہ یہی چیزیں تو جرمن میں بآسانی مل رہی ہوتی ہیں اور وہی کمپنیاں اب دنیا بھر میں پھیلی ہیں۔ اور کہیں ڈالر، یورو، پونڈ، ریال، درہم، پاکستانی اور انڈین کرنسی سمیٹ رہی ہوتی ہیں۔ پوری دنیا میں انھوں نے اپنا دانہ اور جال پھینکا ہوا ہے۔ اور لوگ اس میں بری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ اور ویسے بھی اس معاملے میں ہم بڑے نازک مزاج ہیں۔ ائرپورٹ پر زیادہ سامان اٹھا بنا کر ایک مزدور کی طرح نظر نہیں آنا چاہتے اور اپنے سفر کو ایک خوشگوار سفر ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ تا کہ ہم اپنی ڈائری میں بھی سفر کی اچھی یادداشتیں رقم کر سکیں۔ ورنہ بعد میں کبھی گئے وقت کے ساتھ جب ڈائری کھولیں تو یہ لکھا نہیں پڑھنا چاہتے کہ فلاں ملک سے ہم یہ چیزیں لے کر آئے تھے۔۔

بریانی مصالحہ،

املی پلپ،

چار جوڑی جرابیں،

دو جوڑی جوتے،

گڑ،

خالص گھی،

وغیرہ وغیرہ۔

جیسے یہاں ایک ملنے والی فیملی کے صاحب پاکستان سے واپسی پر ہینڈ کیری کی جگہ ہاتھ میں دس کلو چاول کا پیک پکڑ کر لے آتے تھے۔ اور سب منہ چھپا کر ہنستے تھے کہ کیا جرمن میں چاول نہیں ملتے؟

اور ان کی بیوی بڑے مزے سے لسوڑھے کا اچار لے آتیں اور سب ان کی اس کارگزاری پر حیران بھی ہوتے کہ جہاز میں تو بندہ ہینڈ کیری میں ایسی لیکوئڈ چیزیں تو بالکل نہیں لاسکتا۔ پر اچھی بات یہ ہوتی کہ لسوڑھے کا اچار وہ خود ہی ساری فیملی چٹ نہ کرتی، بلکہ اپنے سب ملنے والوں کو چکھایا جاتا اور پھر سب ان پر داد کے ڈونگرے برساتے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ اگلی بار وہ کوئی اور حیران کن چیز پاکستان سے لے آتے اور سب کی آنکھیں پھٹی رہ جاتیں۔۔ کہ ہیں۔۔ یہ کسٹم والوں کی نظر میں نہیں آئے۔۔

ویسے بھی ہماری کوشش ہوتی ہے کہ سفر کے دوراں کسٹم والے مرحلے سے آسانی سے ہی گزر جائیں، نہ ہم انھیں زحمت دیں اور نہ ہی وہ ہمیں بچھو کی طرح ڈنک ماریں۔ ویسے ایک بار ہمیں بھی اس ان دیکھی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔۔۔

☆☆☆☆☆

خاص تحفہ

ہوا کچھ یوں کہ۔۔

ایک بار پاکستان گئے تھے۔تو ظاہری بات ہے کہ واپسی پر وہاں محبت اور خلوص سے بھر پور ملنے والے چاہے،ان چاہے تحائف بھی ساتھ ہوتے ہیں۔تو گاؤں سے تعلق رکھنے والی ایک رشتہ دار نے ہمیں گاؤں کی خالص لال مرچیں پسوا کران کا ایک ڈیڑھ کلو کا پیک ہمارے ہمراہ کر دیا، یہ کہتے ہوئے کہ۔۔

:جرمن میں کہاں خالص مرچیں آپ کو ملتی ہوں گی۔ویسے بھی سنا ہے کہ گورے تو مرچیں کھاتے ہی نہیں تو جرمن بھی کہاں کھاتے ہوں گے۔اور وہ کھا بھی نہیں سکتے انھیں بھلا کیا پتہ مرچوں کا؟ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ ان کے کھانے کی چیز ہی نہیں۔:

ان کی باتیں سن کر ہم دھیرے دھیرے مسکراتے رہے کہ ان کا کہنا بجا کہ کہاں جرمن اور کہاں مرچیں؟ اور ویسے بھی ہم جرمنوں کو مرچیں نہیں لگانا چاہتے تھے۔کیونکہ ایک بار شرارت میں ایک جرمن کو پکوڑوں کے ساتھ ہرے دھنیے، ہری مرچوں اور پودینے کی چٹنی کھلا دی تھی اور یکدم اس کے ماتھے پر ابھرنے والی پسینے کی بوندیں اور لالولال چہرہ دیکھ کر ہم کچھ نادم سے ہو گئے تھے۔اور اب ہم دل میں اس انوکھے ملے تحفہ کے بارے ان کے بیان کے ساتھ ساتھ سوچتے رہے کہ اب کیا کریں؟ اور ایک بار تو اسے پاکستان میں ہی ٹھکانے لگانے کا خیال بھی من میں آیا۔کہ کون مرچوں اور چٹپٹے کھانوں کا شیدائی ہے، یہ ہم اس کی نذر کر دیں۔پر شائد ہماری سوچ پڑھی گئی یا ان کا دھیان بھی ادھر چلا گیا اور وہ آنٹی کہنے لگیں۔

:یہ ہماری طرف سے اک چھوٹا سا تحفہ سمجھنا تحفہ۔۔اور تحفہ کوئی چھوڑ کے تھوڑی جاتے ہیں اسے چھوڑ کر جانے کا بھی نہ سوچنا ورنہ پتہ چلا تو ہم ناراض ہو جائیں گے۔:

سو ہم نے ان کی پوری تسلی کی کہ،

: ہم تحفے کے قدر دان ہیں اور آپ کی محبت، خلوص ہمارے لیے اک گراں قدر سرمایہ، سو آپ بالکل فکر نہ کریں۔ ہم اسے ساتھ لے کر ہی جائیں گے۔:

بعد میں صورتحال کا جائزہ لیا تو سامان سب پیک ہو چکا تھا۔ تالے تک لگ چکے تھے اور یہ ہمیں آخری لمحات میں ملنے والا تحفہ تھا، سو ہم نے اسے ہینڈ کیری میں ہی مجبوراً رکھ لیا کہ اب دیکھی جائے گی۔ اس وقت ہماری فلائیٹ کچھ ایسی تھی کہ ہم نے رسالہ پور فیصل آباد سے لینی تھی اور پھر کراچی سے اگلی فلائیٹ جرمن کے لیے بک تھی۔ سو ہم فیصل آباد ائر پورٹ پہنچے اور جب چیکنگ میں انھوں نے ایک دو ہاتھ کسی پرفیوم کی تلاش میں ہماری ہینڈ کیری میں مارے تو یہ خاص چیز دیکھ کر ان کو تو مرچیں لگ گئیں۔

انہوں نے کہا

: یہ کیا ہے۔؟:

ہم نے جواب دیا

: جناب یہ سرخ مرچیں ہیں ہانڈی میں ڈالنے کے لیے۔:

اس کے ساتھ ہی ہم نے تصور میں مرچوں والی آنٹی کو یاد کیا کہ دیکھنا اب آئے گا مزا۔؟

انھوں نے پھر پوچھا

: کہاں جا رہے ہیں؟:

جواب دیا۔

: جرمن جا رہے ہیں ہٹلر کے دیس میں۔:

اب انھوں نے ہمدردی سے پوچھا

: کیا جرمنی میں مرچیں نہیں ملتیں؟:

ہم نے کہا

: جی مرچوں کے نام پر مرچیں ملتی ہیں۔ لال شملہ مرچ کو سکھا کر مرچیں بنا دیتے ہیں۔ اب ان مرچوں سے کھانے کا سواد تھوڑی آئے گا۔:

اس پر وہ سو فیصد متفق ہوئے اور فرمایا

: یہ تو بالکل ٹھیک کہا آپ نے، آپکو چاہیئے تھا کہ مرچیں سوٹ کیس میں رکھ لیتے۔ ہاتھ کے سامان میں اس کو لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ ہم تو پرفیوم وغیرہ بھی ہینڈ کیری میں لے جانے نہیں دیتے۔:

ہم نے فرمایا،

: بالکل صحیح کرتے ہیں آپ۔۔ اور ہم آپ کو بھی انڈرسٹینڈ کرتے ہیں۔ کہ جو مسافروں پر پرفیوم چھڑک سکتا ہے، وہ ان کی آنکھوں میں مرچیں بھی بآسانی جھونک سکتا ہے۔:

ہمارے منہ سے اتنی کھلی اور واضح بات سن کر وہ مسکرانے لگے اور کہنے لگے۔

: اب ان مرچوں کا کیا۔۔ کیا جائے۔؟:

ہم نے کہا

: ہم بھی اسی فکر میں غوطہ زن ہیں۔:

تب انھوں نے کہا

: باہر لاونج میں آپ کو سی آف کرنے والے آپکے رشتہ دار ہوں گے۔ انھیں واپس دے دیجیئے۔؟:

ہم نے آنکھیں نم کر کے جواب دیا

: ہم تو لاہور سے آئے ہیں۔ وہ سی آف کا رونا دھونا تو وہاں گھر میں ہو چکا۔ بلکہ پڑوسیوں تک کو رلا کر آئے ہیں۔:

اس پر وہ مسکرانے لگے

: ہونہہ۔۔ یہ تو واقعی فکر طلب بات ہے۔ آپ بتائیں کیا سوچا پھر آپ نے اس بارے میں۔؟:

: ہم کیا سوچیں، ہمارے سوچنے کے لیے تو پورا سفر پڑا ہے۔: ہمیں بھی پتنگے لگ گئے۔

: اچھا ایسا کرتے ہیں کہ آپ مرچیں سوٹ کیس میں رکھ لیں۔:

: کیسے سوٹ کیس میں رکھ لیں۔ وہ تو پہلے ہی آپ کے ہاتھوں سے گزر کر منزل مقصود کی طرف جا چکا۔ اور سامان کی جگہ ہم ہی کب سے کھڑے ہیں۔:

: اچھا چلیں، مرچوں کی علیحدہ بکنگ کر دیتے ہیں۔:

: شکریہ جناب۔۔ جلدی کریں کہیں جہاز ہمارے بغیر ہی نہ چلا جائے۔:

: او، ہاں۔۔ ہاں۔۔:

اب ان کو بھی اس بات کا خیال آیا۔

اور ہم نے بھی معاملہ کسی طرف ہونے پر شکر کیا۔ اب دھیان کیا تو وہاں نہ کوئی اور مسافر تھا اور سامان والے کاونٹر بھی بند ہو چکے تھے۔ بس ائر پورٹ کا عملہ تھا، کچھ مسافر تھے، ہم تھے اور مرچیں تھیں۔ تب انھوں نے مزید صلاح مشورہ کے بغیر خود ہی جلدی سے مرچیں ایک اور کالے رنگ کے شاپر میں ڈالیں، جس پر انھوں نے جلدی سے سفری ٹیگ لگایا اور عملے کے ایک آدمی کو وہ پیکٹ دے کر جہاز کی طرف دوڑا

دیا اور ہمیں بھی جانے کا اشارا کیا۔ ہم بھی معاملہ گو دیر سے سہی لیکن بخوبی نپٹنے پر مسکراتے ہوئے انھیں خدا حافظ کہہ کر چل دیئے۔۔

جہاز دور کھڑا نظر آ رہا تھا۔ جس کی سیڑھی غالبا ابھی ہمارے ہی انتظار میں لگی ہوئی تھی۔ عملے کا آدمی وہ پیکٹ لے کر جہاز کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ اس کی بھاگنے کی رفتار دیکھ کر ہم نے اپنی خراماں خراماں چلنے کی رفتار اور بھی کم کر لی۔ بھئی آخر یہ ہمارے بغیر جہاز اڑا ئیں گے تو نہیں ،تو جلدی کا ہے کی۔؟ آخر انھوں نے بھی تو ہمارا اتنا وقت انٹرویو میں برباد کیا ہے نا، اچھا ہوتا اگر انٹرویو کی جگہ مرچیں ہی رکھ لیتے تو۔ ہم ان خیالات کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔

جہاز میں بیٹھتے ہی اور دوران پرواز جب ہم نے پورے معاملے کا جائزہ لیا تو عجب سی کیفیت تھی۔

آنٹی کی مرچوں والی محبت۔۔

ائر پورٹ پر ہوئی پرابلم۔۔

عملے کی مہربانی۔۔

وقت کی بربادی۔۔

لیکن اب چونکہ مرچیں علیحدہ بک ہوئی تھیں۔ اس لیے ہمیں امید نہیں تھی کہ وہ ہمیں صحیح سلامت مل پائیں گی۔ ایک تو چھوٹا پیکٹ ،اوپر سے لوگوں کے بھارے سوٹ کیسوں کے درمیاں وہ تو کچلا ہی جائے گا۔ اس لیے اسے بھول جانا ہی بہتر ہے۔ چلیں اب جو بھی ہو،بہتر ہی ہو۔ یہ سوچ کر دل کو بہلا لیا اور باقی سفر اس سوچ سے فری ہو گیا۔ یہ مقامی فلائٹ تھی۔ کراچی پہنچ کر جرمنی کے لیے فلائٹ لینا تھا۔ سو جہاز سے اتر کر سامان آنے والی بیلٹ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اپنے متوقع سامان کے منتظر ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ بیلٹ چلنا شروع ہوگئی۔ ابھی سامان نہیں آیا تھا۔ کچھ چکر اس کے خالی لگے۔ پھر سامان آنا شروع ہوا اور یکدم بیلٹ پر دیکھ کر ہمارا دماغ چکرا گیا۔ جن مرچوں کو ہم نے اپنی یادداشت سے بھی دور کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ وہ سب سے پہلے بیلٹ پر چلی آرہی تھیں۔ نہ اس کے آگے کوئی بیگ نہ تھا نہ پیچھے کوئی سوٹ کیس۔۔ اور سب انتظار کرتے مسافروں کی نظریں اس کالے ٹیگ لگے کالے شاپر پر لگی ہوئی تھیں۔ اور ابھی دور دور تک باقی سامان نظر بھی نہیں آرہا تھا۔ ہم نے اس پیکٹ کے تین چار راؤنڈ بیلٹ پر لگنے دیئے۔ تاکہ سب حیران کن نظروں سے دیکھتے مسافروں کی نظریں اسے دیکھ کر سیر ہو جائیں۔ پھر ایک چکر میں جیسے ہی وہ ہمارے سامنے آئیں تو ہم نے چپکے سے بڑھ کر وہ پیکٹ اچک لیا۔ اب ہمارے سامنے ایک بار پھر مرچوں کو ٹھکانے لگانے کی صورتحال کھڑی تھی، لیکن اب کی بار ہمیں اتنی مشکل نہیں ہوئی۔ کیونکہ ہم نے ایک سوٹ کیس کا لاک کھول کر پیکٹ اس میں ڈال دیا۔ یوں آگے کا سفر بغیر کسی پریشانی اور الجھن کے طے ہوگیا۔ لیکن آئندہ کے لیے ہم نے سوچ لیا کہ آخر وقت میں ملے تحائف پر نظر ثانی ضرور کیا کریں گے۔۔

لاہور یاد آنے لگا

سچ پوچھیں تو ٹورنٹو میں رہ کر قیام کے دوران ہمیں لاہور بہت یاد آتا رہا۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ہمیں جرمنی زیادہ یاد آتا کہ اب وہاں کے باسی ہیں اور جرمنی میں بھی جرمن انگریز اور کینیڈا میں بھی کنیڈین گورے۔ کیا ہوا جو کینیڈا یورپ میں نہیں لیکن انگلینڈ کا جڑواں بھائی تو ہے نا۔ لیکن اپنی ان آنکھوں سے دیکھ کر بھی ہمیں انگلینڈ اور کینیڈا میں کوئی مماثلت نظر نہیں آئی۔ سوائے اس کے کہ ملکہ صاحبہ دوڈالر کے سکے پر اپنا آپ ہٹلر کی طرح منوانے پر مصر تھیں اور ہم اس محبت کو ڈھونڈتے ہی رہ گئے۔ اوپر سے غضب خدا کا کینیڈا کی زمین پر کھڑے ہو کر بھی ہمیں اصل خالص کنیڈین نظر نہیں آتے تھے۔ بلکہ ہمیں کئی بار ایسا بھی لگتا جیسے کسی پکنک سپاٹ پر بہت سے شہروں کے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ تو ٹورنٹو میں بھی ایسا ہی لگتا کہ جیسے بہت ساری قوموں کے لوگ یہاں اکٹھے کھانے پینے، سونے، باتیں کرنے، لائبریری میں کتابیں پڑھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ دن میں نکل کر یہ آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں اور رات کو اپنے اپنے سیل میں گھس جاتے ہیں۔۔

پھر یہاں جگہ جگہ ریسٹورنٹ، ہوٹل نظر آتے، اور دوست یار لوگ مل کر بھی کھانے کی ہی باتیں کرتے کہ پٹنہ کی بریانی مشہور ہے اور حویلی کا بوفے سسٹم، اور فلاں چینی ریسٹورنٹ کے فرائڈ رائس اور چکن چلی بہت مزے کے ہیں تو ہمیں کیسے لاہور یاد نہ آتا۔ آخر یہ لاہوری ہی ہیں جو خوش خوراک ہیں۔ جو خود بھی اچھا کھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی اچھا کھلانا چاہتے ہیں۔ اور لاہور میں کئی کئی فوڈ سٹریٹ اس بات کی گواہ رہی ہیں۔ پھجے کے پائے، ریگل چوک کے دہی بڑے، چمن والوں کی آئس۔۔ قدردانوں نے آخر یونہی تو نہیں انھیں نامور بنا دیا۔ یوں یہ خوش خوراکی پھیلی اور یہ خوش خوراک جب اور ملکوں میں

ملکوں میں پھیلے تو اپنے شوق بھی وہیں ساتھ لے گئے اور اس شوق کو اپنے کاروبار کے ذریعے پھیلا دیا۔ اچھی بات یہ رہی کہ اپنے کھانوں کے ساتھ ساتھ۔۔لاہور۔۔کو بھی مشہور کر دیا۔ جبکہ در پردہ اس کے نام کی آڑ میں اپنا کاروبار چمکا لیا۔ لاہور کڑاہی ہاؤس۔۔لاہوری چرغہ۔۔لاہوری فش۔۔لاہوری کباب ہاؤس۔۔لاہوری چٹپٹے کھانے۔۔، لندن میں یہ بزنس خوب جما اور کینیڈا میں بھی، جبکہ جرمن میں ہمیں آج تک لاہور نظر نہیں آیا۔۔

خیر جہاں اپنے کلچر کی بات ہوگی وہاں کھانے پینے کی باتیں تو لازم ہیں۔ ہمیں تو ٹورنٹو میں گھر کی دعوتیں بھی بڑی جدت لیے ہوئے لگیں اور ہم ان سے بھی متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ بڑے بڑے گھروں میں کھانے کو پیش کرنے کا اور ہی انداز ہے۔ کچھ فوفے سسٹم جیسا اور پارٹیز میں بھی یہی طریقہ چلتا ہے۔ ریسٹورنٹ میں بھی کہیں کہیں یہی طریقہ ملے گا۔ یہ انداز پرکشش بھی ہے پر تھوڑا مہنگا بھی۔۔، جبکہ جرمنی میں آج بھی روایتی طریقے سے دل لگا کر مہمان کے لیے کھانے کی میز آراستہ کی جاتی ہے۔ میز پر اچھی کراکری نیپکن سجائے جاتے ہیں۔ ایک آدھ پھولوں کا گلدستہ جمانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ڈنر ہو تو کینڈل ڈنر جیسا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پھر گرم گرم کھانا سرو کیا جاتا ہے۔ کیونکہ جرمن کا ہی ایک محاورہ ہے کہ پہلے آنکھ کھانا کھاتی ہے۔ اونہوں۔۔ چونکیے مت، یہ صرف محاورا ہے۔۔ ورنہ آنکھ صرف اپنا ہی کام کرتی ہے۔ اور میز اچھی طرح سجانے کا مطلب ہی یہی ہے کہ آپ کھانے کے لیے دوسروں کو اس موڈ اور کیفیت میں لا رہے ہیں۔ اور بعض دفعہ بھوک نہیں بھی ہوتی تو اچھی مزیدار کھانوں سے سجی میز فوراً اپنی طرف راغب کر لیتی ہے۔ پھر بار بار مہمان سے۔۔ اور لیں کھانا۔۔ پلیز یہ چکھیں ذرا۔ ارے یہ بٹر چکن تو بنایا ہی خاص آپ کے لیے ہے۔ اور میٹھا ضرور لیجئے، آپ کے لیے خاص

یہ بنایا ہے۔۔

سو کھانے کے ساتھ ساتھ میزبان کی میزبانی بھی چلتی رہتی ہے۔ اور مہمان کھانا کم کھائے تو فکر اندیشے رہتے ہیں کہ غالباً اسے کھانا اتنا پسند نہیں آیا۔ بس نہیں چلتا کہ میزبان اپنے ہاتھوں سے مہمان کو کھانا کھلا دے۔ اور بار بار مہمان سے کھانے کے لذت دار ہونے کا پوچھتا رہتا ہے۔ سو یہاں مہمان بننے میں بڑی راحت محسوس ہوتی ہے۔۔۔

گھر کی دعوتیں

ہم نے دیکھا کہ کینیڈا میں چھوٹے گھروں میں کھانے کی ڈشز میز پر لگادی جاتی ہیں۔اور کھانا شروع کرنے کا فرمان سنتے ہی سب جا کر میز کا جیسے گھیراؤ کرلیتے ہیں اور ہرکوئی اپنی پلیٹ میں کھانا نکالنے لگتا ہے۔کسی کا ہاتھ بریانی ڈالنے کا چمچ سنبھالے ہوئے ہے تو کوئی اپنی پلیٹ میں سلاد ڈالنے میں مصروف،کوئی مہربان کباب لینے میں مگن اور کوئی سالن کے ڈونگوں کی نقاب کشی کررہا ہے۔دوست احباب یا اپنے قریبی ملنے والے ہوں یا رشتے دار۔۔تو کوئی ہچکچاہٹ نہیں،ایک فیملی جیسے ماحول میں کھانا کھایا جاتا ہے۔پلیٹوں میں اپنے اپنے حصے کا کھانا لے کر سب جیسے شانت ہوجاتے ہیں اور پھر جہاں جگہ ملے سما جاتے ہیں۔چاہے وہ کرسی ہو یا صوفہ اور درویش مزاج رکھنے والے تو آرام سے نیچے قالین پر بھی بیٹھ جاتے ہیں۔کھانے کے ساتھ باتیں بھی لازم ہیں اور کھانے کی تعریف بھی۔۔اور مزے سے کھاتے ہوئے بیچ بیچ میں دوبارہ جا کر اپنی پسند کی کسی ڈش سے بھی انصاف کیا جاتا ہے۔۔ کھانا کھا کر سب جیسے پرسکون ہوجاتے ہیں۔اور پھر میز سے برتن اٹھانے اور کچن میں پہنچانے کا کام شروع ہوجاتا ہے۔۔بھئی،ابھی ایک بار اور میز سجنی ہے سویٹ ڈش کے لیے۔جسے کچھ وقفے کے بعد کھانا زیادہ مناسب لگتا ہے۔اور یہ بات بہت اچھی لگتی ہے کہ اب میزبان کی مدد کے لیے کافی لوگ موجود ہوتے ہیں، جو میزبان کے۔۔نہ نہ۔۔کرنے پر بھی نہیں سنتے اور اس کی ہیلپ پر مصر رہتے ہیں۔ویسے اس طرح میزبان کے لیے بھی کافی اچھا رہتا ہے اور وہ خوامخواہ کی تھکاوٹ سے بچ جاتا ہے۔مہمانوں کے لیے یہی کم نہیں ہوتا کہ میزبان نے پہلے ہی دل لگا کر اتنا کھانا بنایا ہے۔سو اب وہ بھی کچھ فرصت اور سہولت سے ہوجائے۔ہمیں یہ طریقہ کار بھی اچھا لگا کہ اگر ویسے ہی سب دوست ملنا

چاہ رہے ہیں، اکٹھے ہو رہے ہیں تو سب خود ہی ایک ایک ڈش کا اہتمام کر لیتے ہیں۔ اس طرح میزبان پر بھی زیادہ بار نہیں پڑتا۔ جلدی جلدی سب سمیٹا سمیٹی کر کے اک بار پھر محفل جمتی ہے۔ اس دوران اگر کسی نے سگریٹ کے کش لگانا ہیں تو اس کے لیے بھی یہ اچھا موقع اور وقت رہتا ہے۔ اور وہ بھی نظروں سے ادھر ادھر اوجھل ہو جاتا ہے۔ ویسے یہ بات ہمیں سگریٹ پینے کے آداب کے مطابق لگی کہ سٹنگ لاؤنج میں سب کے درمیان بیٹھ کر سگریٹ کے کش پہ کش نہیں لگائے جاتے اور نہ ہی کمرا دھوئیں کے غبار کی نذر کر دیا جاتا ہے بلکہ چھوٹے بچوں کا خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی صحت کے لیے دھواں مضر ہے۔ اور بڑے بچوں سے اس لیے چھپایا جاتا ہے کہ ان کو پتہ نہ چلے کہ پاپا سگریٹ پی رہے ہیں۔ ورنہ مستقبل میں ان کے پینے کے چانسز بھی بڑھ جائیں گے۔ اور پھر کس طرح ان کو روک ٹوک کی جائے گی۔ اس وقت یہ سوچ بے اختیار چلی آتی کہ بھئی سگریٹ پینا واقعی بری بات ہے تو اسے خود بھی چھوڑنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔؟ اس بات پہ دل میں خوب پھلجڑی چھوٹتی تھی، جب ہم تین چار دوستوں کو گروپ کی صورت غائب ہوتے دیکھتے اور باقی نہ پینے والے یا تو اہل خانہ کی مدد میں جٹے ہوتے یا وہ ٹی وی کے آگے بیٹھ جاتے۔ پر اچھی بات یہ ہے کہ وقت کے ساتھ جہاں اگر کچھ ادب آداب چلے گئے ہیں تو وہاں اچھی باتیں بھی آئی ہیں۔ ورنہ پہلے لوگ تو پوری محفل میں حقہ گڑ گڑایا کرتے تھے۔ چاہے کسی کو اچھا لگے یا نہ لگے۔ بلکہ وہ ساتھ بیٹھنے والے کو بھی کش لگانے کی آفر اور اجازت دیا کرتے تھے۔ یہ حقہ بھی ایک بڑی ثقافتی شے رہا ہے۔ ہمارے کلچر کا حصہ، یہ ایک مزے کی چیز لگا کرتا۔ جب بھی کبھی گاؤں کی طرف جانا ہوا۔ یہ ہمیں ہر گھر میں ایک فرد کی طرح نظر آتا۔ جو کبھی کسی کے پہلو میں بیٹھا ہے اور کبھی کسی کے، کبھی یہ پوری محفل میں سب کو باری دے رہا ہے اور کبھی کوئی اسے لے کر چارپائی پر بیٹھا ہے۔۔

کبھی یہ جان محفل ہے اور کبھی کسی کی تنہائی کا ساتھی۔اب سگریٹ پینے والے خود ہی احساس جرم میں مبتلا رہتے ہیں۔صد شکر کہ یہ کسی کو آفر نہیں کرتے۔خیر یہ بات تو پینے والوں کو سوچنی چاہیئے۔سویٹ ڈش اور چائے کے لیے ایک بار پھر محفل جمتی ہے۔ٹورنٹو میں یہ محفلیں بڑی رونق دیتی ہیں۔کافی لوگ ایسے ہیں جن کے اپنے پیارے سب یہیں پر ہیں۔سو ان کی تو گھر کی محفل ہوتی ہے اور جن کے نہ ہوں تو سب دوست احباب اکثر مل بیٹھتے ہیں اور دیس ،رشتہ داروں کی کمی کافی حد تک ایسے پوری کر لی جاتی ہے۔اور بعض دفعہ زندگی اس بات کی بھی تفسیر بن جاتی ہے۔

عرصہ زیست کی خاموش گزرگاہوں میں
اجنبی آتے ہیں ملتے ہیں بچھڑ جاتے ہیں
صفحہ ذہن پہ رہ جاتے ہیں یادوں کے نقوش
وقت کے ہاتھوں بنتے ہیں بگڑ جاتے ہیں

کینیڈا میں جن لوگوں کے اپنے بڑے بڑے گھر ہیں۔ان کا لائف سٹائل کچھ اور ہے۔۔
ان کے پاس بڑے بڑے کچن موجود ہیں۔جس میں ایک طرف اکثر ٹی وی لاؤنج بھی ہوتا ہے۔
خوبصورت کچن میں کھانا تیار کر کے کچن میں سائیڈ بورڈ پر رکھ دیا جاتا ہے۔اور کھانا شروع کرنے کے لیے سب سے پہلے مہمان کو دعوت دی جاتی ہے۔اور اگر آپس کی گیدرنگ ہے تو پھر مرد حضرات کو پہلے کھانا لینے کے لیے کہا جاتا ہے۔وہ اپنا کھانا لے کر مردانہ حصے میں چلے جاتے ہیں اور عورتیں کھانا لے کر کچن میں ہی اپنی جگہ،کرسی،صوفے پر بنا لیتی ہیں۔اور کھانے کو انجوائے کرتی ہیں۔کینیڈا میں پارٹی ، فنکشن،گیدرنگ بہت ہوتی ہے اور اکثر ہوتی ہے۔کہیں مخلوط پارٹی ہے تو کسی جگہ علیحدہ علیحدہ سما جاتے

ہیں۔لوگ اس کے عادی بھی ہیں۔اگر اپنے رشتہ دار لوگ وہاں ہوں تو گھر کی گیدر نگ میں اکثر پچاس، ساٹھ تک لوگوں کی تعداد پہنچ جاتی ہے۔ہم نے دیکھا کہ کئی بار ایسے مواقع پر ڈسپوزل پلیٹیں گلاس استعمال کیے جاتے ہیں اور کسی جگہ میز بان خوبصورت سی کراکرای بھی رکھتے ہیں۔ یہ اپنی اپنی پسند اور سہولت پر منحصر ہے۔اور اکثر کھانا خوبصورت کراکری ڈشوں،ڈونگوں میں پیش کیا جاتا ہے اور کسی جگہ میز بان نے بڑے بڑے پتیلوں میں ہی کھانا سرو کر دیا۔اس اپنائیت پہ تو ہمارا دل چاہتا تھا کہ ہم میز بان کو گلے سے لگا لیں۔اور کھانے کی ڈشوں کو بھی پیش کرنے کا ایک اپنا ہی انداز ہے۔ایک گھر میں ہمیں بہت اچھا لگا کہ جب کھانا شروع کرنے کے لیے کہا گیا تو سب نے اپنی اپنی پلیٹیں ہاتھوں میں تھام لیں اور کھانا اتنا اچھا اس ترتیب سے سجایا گیا تھا جیسے میز بان کو پکا اندازہ ہو کہ اب مہمان اپنی پلیٹ میں کیا اگلی چیز لے گا۔جیسے پہلے سلاد پلیٹ میں لے گا،سلاد کے ساتھ بریانی کی ڈش،پھر مختلف کباب،پھر روسٹ،چکن، قورمے،رائتہ اور آخر میں نان۔۔اس طرح بندہ ایک سرے سے شروع ہوتا تو ترتیب سے آخر تک کھانا لیتا ہوا پہنچ جاتا۔اور کوئی افراتفری،ہنگامے جیسے سماں نہ ہوا۔ یہ کچھ کچھ بوفے سٹائل سسٹم ہمیں بھی بڑا اچھا لگا۔ یہ طریق ہم نے بھی جرمنی میں اپنانا چاہا۔کھانا ایک علیحدہ میز پر سجا دیا اور مہمانوں سے کھانا شروع کرنے کی درخواست کی۔مہمان پہلے تو تھوڑے حیران،پریشان نظر آئے کہ کھانا کہیں ہے اور کھانا لے کر بیٹھنا اور جگہ ہے۔ہمارے کہنے پر انھوں نے کھانا تو اپنی پلیٹوں میں لے لیا اور جا کر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔اس کے بعد جو وہ اپنی جگہوں پہ بیٹھے تو دوبارہ ہلنے کا نام ہی نہیں لیا۔ان میں سے جو بھی کوئی اپنے لیے کھانے کی آئیٹم لینے جاتا،باقی بھی اسے ہی کہنے لگتے کہ پلیز ہمیں بھی یہ تھوڑا لا دو۔سو ہم نے بھی دیکھ لیا کہ یہ سستی کے مارے مہربان مہمان اب نہیں ہلیں گے۔انہیں تو کھانا ہر حال میں

اپنے آگے میز پر ہی چاہیے۔ بھئی آخر عادت جاتے جاتے ہی جائیگی۔ اور انکو یہ عادت ڈالی بھی تو جرمن کے کلچر نے ہے۔ سو جرمن میں سب بوفے سٹائل کھانے کو پسند تو کرتے ہیں لیکن صرف کسی فنکشن اور پارٹی میں ۔۔ سو کچھ چیزیں قابل قبول ہوتے ہوئے بھی کسی جگہ نہیں چل پاتیں اور ہم نے یہ بات صدق دل سے مان لی اور اسی لیے ہم آج بھی جرمنی میں مہمانوں کے لیے کھانے کی میز دل و جان سے سجاتے ہیں۔۔۔

پہچان

قسمت کے آگے کس کا زور چلا ہے اور اسی زور کے نتیجے میں جرمنی ہمارا ہوم لینڈ بن چکا ہے، جبکہ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ہٹلر کے دیس اٹھ آئیں گے اور جرمنوں کا وافر دیدار کریں گے۔ جبکہ دل تو ہر وقت۔۔

میں بھی پاکستان ہوں تو بھی پاکستان ہے

تو، تو میری جان ہے تو میرا ایمان ہے

الاپتا ہے۔ تیئیس مارچ کو ہم بے اختیار گانے لگتے ہیں۔

وطن کی مٹی گواہ رہنا۔۔ گواہ رہنا

وطن کی مٹی عظیم ہے تو عظیم تر ہم بنا رہے ہیں

اور چودہ اگست کو زور و شور سے گاتے ہیں۔

یوں دی ہمیں آزادی کہ دنیا ہوئی حیران

اے قائداعظم ترا احسان ہے احسان

پھر بھی ہمیں کبھی اتنی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ جرمنوں کو اگر ہمارے بارے میں جاننے کا اشتیاق بھی اٹھتا تو سیدھے سادھے الفاظ میں پوچھ لیتے کہ ہم کس ملک سے آئے ہیں؟ تو کچھ سال پہلے جب ہم اس بات کا جواب دیتے تو جرمن پاکستان کے نام پر لاعلمی کا اظہار کر دیتے۔ پھر ہمیں ایران، افغانستان، انڈیا کے قرب و جوار کا حوالہ دے کر اپنا آپ ان کے روبرو منوانا پڑتا۔ اور اس وقت ہمیں دل میں ان پر بڑا غصہ آتا۔۔

: کیا پاکستان کو نہیں جانتے؟:

اور آج ہمارے منہ سے پاکستان کا نام سن کر وہ کچھ چوکنے سے ہو جاتے ہیں۔اور ہم دل میں مسکاتے ہیں کہ اب آیا سمجھ میں پاکستان کا نام۔۔۔،

اور اپنی پہچان کے حوالے سے ایک بار پھر اک نیا مرحلہ ہمارے سامنے تھا۔جب ٹورنٹو میں کوئی ہم سے پوچھنے لگتا،

:آپ کس ملک سے ہیں؟:

تو اک لمحے کو ہم چکرا سے جاتے۔اور اپنی اصلی پہچان ڈھونڈنے لگتے۔کیونکہ جب اپنی بائیوگرافی پہ نظر ڈالتے تو۔۔جرمنی اور پیچھے پاکستان دونوں نظر آتے۔سو کبھی منہ سے جرمنی نکلتا اور کبھی پاکستان۔۔

ایک دن غور کیا تو مثبت پہلو سامنے آیا کہ ہمارے پاس تو جواب دینے کے دو دو آپشن موجود ہیں۔کبھی حس مزاح پھڑکتی تو اگلے بندے کو جواب دیتے کہ اصل میں تو پاکستانی ہیں لیکن رہتے جرمن کی گود میں ہیں۔وہیں کھاتے پیتے ہیں،سوتے ہیں اور اٹھکیلیاں کرتے ہیں۔تب اگلے بندے کو بخوبی سمجھ آجاتی۔

کینیڈا میں رہنے والے لوگ اپنی اس قومیت سے خاصے خوش ہیں اور آنے والے ہر مہمان سے تقریبا یہ سوال ضرور پوچھا جاتا ہے،

آپ کو کینیڈا کیسا لگا۔؟

جب انھیں ہمارے بارے پتہ چلتا تو پھر وہ جرمنی اور یورپ کے بارے میں بھی ضرور جاننا چاہتے اور مختلف سوالات کرنے لگتے۔۔

☆☆☆☆☆

خدانخواستہ

جرمنی سے ہم جب بھی پاکستان کی طرف جائیں تو ہمیں کوئی خاص فکر نہیں ہوتی۔شروع میں البتہ ضرور حفظ ماتقدم کے طور پر انجکشن لگوا کر،دوائیاں لے کر جاتے رہے۔لیکن ایک بار دوا دارو کے باوجود پاکستان جا کر ایسا بیمار ہوئے کہ بستر ہی پکڑلیا۔اس جرمن دوا نے بھی کچھ کام نہ کیا۔وہاں موجود گھر والے بھی ہماری جن جرمن دوائیوں سے پہلے مرعوب رہا کرتے تھے۔اب وہ بھی انھیں مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔اور تبھی ایک مقامی ڈاکٹر کی قسمت چمک پڑی اور وہ ہمارا علاج کرنے لگا۔ہم جلدی تندرست تو ہو گئے۔لیکن اب دوبارہ پاکستان دوائیاں لے کر نہیں جاتے۔بھئی پاکستان میں اتنا کچھ تو ملتا ہے تو کیا دوائیاں نہ ملیں گی۔۔

لیکن یہاں یورپ سے کسی اور ملک جائیں تو سوٹ کیس پیکنگ کے ساتھ ساتھ ایک اہم ورد بھی زبان پر رہتا ہے کہ یا شافی ،یا کافی ۔۔یا اللہ،ہم جہاں بھی جائیں اپنی امان میں رکھیو۔ہم تو مہمان جا رہے ہیں۔وہاں جا کر بیماری سے لوٹ پوٹ نہ ہوں،خیر خیریت سے واپس آئیں اور دوست احباب کو صرف اور صرف اپنے ٹرپ کے قصے ہی سنائیں،خدانخواستہ،کہیں علیل نہ ہوں اور ہمیں اپنی بیماری کی کہانی نہ سنانی پڑ جائے۔ویسے تو اللہ کا ہم پہ خاص کرم رہتا ہے کہ جلدی کبھی سر درد بھی نہیں ہوا کہ ہمیں سر پر پٹی باندھ کر ہائے ہائے کرنے کی ضرورت پڑی ہو۔لیکن جب کسی بیماری کا وائرس پھیلا ہو تو خدشہ تو بہر حال رہتا ہے نا۔اور دوسرے ملک کی آب وہوا بھی جرمن میں بیٹھ کر مشکوک نظر آتی ہے۔پاکستان کا ڈینگی ہمیں یہاں بیٹھ کر ہی بچھو جیسا نظر آتا ہے۔البتہ انگلینڈ جاتے ہوئے کبھی اتنی فکر نہ ہوئی۔آخر وہ پڑوس میں تو ہے انگلینڈ۔۔یہاں اور وہاں کے وائرس بھی یقیناً دوست ہوں گے اور ان کا علاج معالجہ

بھی۔۔ فکر تو اب ہمیں ہوتی ہے جب ہم کینیڈا کی طرف نکل جائیں۔ایک تو لمبا ٹور ہوتا ہے۔۔جس میں۔۔اللہ نہ کرے۔۔بیمار ہونے کا خدشہ بھی لاحق رہتا ہے۔سر درد،زکام،کھانسی،موسمی بخار،اور اس بات سے بڑا ڈر رہتا ہے کہ کہیں ہم وہاں وائرس کے موسم میں نہ پہنچ جائیں۔اور اچھے مزیدار کھانوں کی بجائے کڑوی کسیلی دوائیاں کھانے پہ مجبور ہوں۔چائنیز سوپ پی رہے ہوں۔نقاہت سے جان جا رہی ہو۔دعوتیں اگلی تاریخوں پہ جا پڑیں۔فطرت کے حسین نظاروں کی بجائے ایک کمرے کے در و دیوار جانچ رہے ہوں۔اس لیے جانے سے پہلے خاص پلاننگ کی جاتی ہے کہ۔۔خدانخواستہ۔۔وہاں بیمار پڑ بھی جائیں تو کیا کریں؟ کیونکہ بارہا سنا ہے کہ کینیڈا کا میڈیکل بس۔۔گزارا۔۔ہی ہے۔جو چیز پاس ہو۔واقعی اس کی قدر محسوس نہیں ہوتی، جب تک اس کا موازنہ، نہ کیا جائے۔کچھ ایسے مہربانوں کی بدولت ہمارے نالج میں اضافہ ہوا، جو جرمنی سے ٹرانسفر ہو کر کینیڈا اور روم گئے۔بقول ان کے جرمنی جیسا میڈیکل کہیں نہیں۔اس لیے پچھلی بار کینیڈا جاتے ہوئے ہم اپنی ایک ہیلتھ انشورنس خرید کر لے گئے تھے۔اللہ کا فضل رہا اور اس کی ضرورت ہی نہ پڑی۔اس بار اللہ بھروسے چلے گئے اور کوئی بھی ہیلتھ انشورنس نہ لی۔لیکن اس بات کا احساس وہاں جا کر ہوا۔جب قدم پھونک پھونک کر رکھنے پڑے۔کسی وائرس کا نام سن کر ہی طبیعت یا اللہ خیر، کا ورد کرنے لگتی۔اچھی بات یہ رہی کہ دوائیاں کافی ساتھ لے گئے۔وہ دوائیاں بھی جن کی اللہ کے فضل سے کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔لیکن اس۔۔کیا پتہ۔۔کے ہاتھوں بخار،فلو،سر،ناک،کان،آنکھ،گلے کی سب دوائیاں رکھ لیں۔پر اللہ کا بڑا کرم رہا۔بلکہ ہم اپنی دوائیاں میزبانوں کی طبیعت خراب ہونے کی صورت فوراً نکال کر انھیں آفر کر دیتے۔اور دل میں مطمئن بھی ہوتے کہ آخر کہیں نہ کہیں ہم بھی ان کے کچھ کام آ رہے ہیں۔۔۔

کرسمس اور نیا سال

ہم اپنی عید کے تہوار اور فنکشن تو کئی ملکوں میں منا چکے ہیں، دیکھ چکے ہیں۔ کبھی یہ تہوار اپنوں کے سنگ منائے ہیں اور کبھی ہم وطنوں کے ساتھ۔ لیکن گوروں کی عید یعنی کرسمس ہم پہلی بار جرمنی کے علاوہ کسی اور ملک میں دیکھ رہے تھے۔ اور ہمارا بالکل وہی حال ہوتا تھا جو پاکستان میں رہتے اپنی عید مناتے ملک میں باقی اقلیتوں کا ہوتا ہوگا۔ حالانکہ یہ تہوار تو گوروں کا ہے۔ بھئی، ہمارا اس سے کیا لینا دینا لیکن نہ جائے رفتن نہ پائے رفتن والا حساب ہو گیا تھا۔ پانسہ پلٹ گیا تھا۔ اب اقلیت بن کر تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں اور چاہتے ہوئے بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کیا کرتے دسمبر شروع ہوتے ہی یہ دونوں تہوار چلے آتے ہیں۔ اور ایک ماہ پہلے ہی اس کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ ایک دو دن کی بات ہوتی تو ہم گوشہ نشین ہی ہو جاتے۔ دسمبر تو پہلے ہی ہمارے دل پر اک ہجر کی طرح اترتا ہے۔ دن مٹیالے سے ہو جاتے ہیں۔ سورج پہلے جیسی آب و تاب سے نہیں چمکتا۔ سرما کا چاند مدہم ہو جاتا ہے۔ رنگ کہیں کھو جاتے ہیں۔۔۔

تصویر

سال نو،

دسمبر۔۔ سنوفال

کینوس پہ نیا کاغذ آ چکا ہے

اے مصور!

تیری نئی تصویر کا انتظار رہے گا

پھر آس پاس کا ماحول رنگین ہونا شروع ہو جاتا ہے۔جس میں ایک طرف اگر فطرت سفیدی بکھیر دیتی ہے تو دوسری طرف اس کے بالکل برخلاف مصنوعی روشنیاں اور رنگینیاں اترنے لگتی ہیں۔ایک ساتھ دو دو تہوار جو آ رہے ہیں۔کرسمس اور نیوائیر۔۔سو کرسمس کے لیے بازار،شاپنگ مالز اور مسیحیوں کے درودیوار سجنے لگتے ہیں۔ایسا لگنے لگتا ہے جیسے کسی مقابلے کا سماں ہے اور اس کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ کینیڈا میں تو ویک اینڈ ویسے ہی بڑا پرکشش لگتا ہے۔کہ اب اپنے لیے کچھ نہ کچھ کرنے کا وقت ہوگا۔ شاپنگ کیلئے جایا جائے گا۔دوست احباب یا عزیز اقرباء اکٹھے ہو سکتے ہیں۔موسم اچھا ہوگا تو کسی پارک جاسکتے ہیں۔سینما جاسکتے ہیں یا کچھ اور پلان کیا جاسکتا ہے۔یہاں تو جرمنی والی مجبوری بھی نہیں کہ شاپنگ ہر صورت ہفتے کو ہی کرنی ہوگی۔کیونکہ اتوار ٹوٹلی چھٹی کا دن۔۔بازار،شاپنگ کا سلسلہ ہی نہیں۔۔کئی بار اس بات پر چڑ بھی اٹھتی ہے کہ یہ کیسا قانون۔۔یہ کیسا انصاف۔۔؟کہ ہفتے میں ایک دن پابندی کا بھی ہے۔اس لیے کھانے پینے کی بیشتر اشیاء سٹور کرنی پڑتی ہیں۔بھئی مہمان تو فرصت سے اتوار کو ہی آئیں گے نا۔۔خیر،مجبوری سے سمجھوتہ کرنا ہی پڑتا ہے۔دل چاہے یا نہ چاہے۔۔

تو اب کی بار ہم ٹورنٹو میں آنے والی کرسمس کے رنگین نظارے دیکھ رہے تھے۔گھروں کو اتنی خوبصورتی سے سجایا جا رہا تھا کہ شوق سے تمنا کی جاسکتی تھی کہ پورا سال دسمبر ہی رہے۔اور دسمبر کہاں اداس ہوتا ہے ؟برف کی سفید چادر پر ہزاروں رنگین قمقمے شیشہ گری کرتے ہیں۔مصنوعی روشنیوں کی تو پہلے بھی یہاں کچھ کمی نہیں۔پچھلی بار جولائی کے مہینے میں آئے تھے۔گرمی کا کچھ سماں تھا۔دوپہر کے بعد فلائٹ پہنچی تھی۔تو کھانا کھانے کے بعد میزبانوں کے گھر کے باہر ذرا سا جھانکا تھا تو بڑی بڑی ہائی بلڈنگز ہی نظر آئیں۔اور جب شام مغرب کے بعد باہر کا نظارا کیا تو اف خدیا،کتنا پیارا اور خوبصورت منظر

نظروں کے سامنے تھا۔ دن کے وقت جو ہائی بلڈنگز اک روکھا بنجر سا تاثر دے رہی تھیں ۔ رات ہوتے ہی روشنیوں میں نہا گئیں ۔ جدھر بھی نظر اٹھتی ۔ سینکڑوں جھلمل جھلمل کرتی روشنیاں نظر آتیں۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے آسمان سے جگہ جگہ کہکشاں اتر آئی ہو۔۔

اس بار بھی ایسا ہی تھا کہ رات ہوتے ہی ہر سو دور دور تک روشنیاں نظر آتیں۔ اور گئی رات تک یہ سماں جاری رہتا۔ اور اگر ایسے میں بارش ہونے لگتی تو اس خوبصورتی کو اور بھی چار چاند لگ جاتے۔ بھیگا بھیگا سا سماں دل پر اترنے لگتا۔ اور کرسمس کی تیاری شروع ہوئی تو لگتا تھا، ماحول سولہ سنگھار کیے ہوئے ہے۔ ہر بلڈنگ کے بیشتر در و دبام رنگ برنگے قمقموں سے سجنے لگے اور شام ہوتے ہی وہ جلنے بجھنے لگتے۔ اور رات کو جب کبھی کھڑکی سے باہر نگاہ پڑتی تو سارا عالم سویا سویا سا لگتا اور وہ رنگ برنگی روشنی اپنے ہونے کا احساس دلاتیں۔۔

دسمبر شروع ہو چکا تھا۔ خزاں کے پتے بکھر چکے تھے۔ لگتا تھا جیسے درخت اپنے خالی پن کے ساتھ اک سوگ کی کیفیت میں کھڑے ہیں۔ لیکن جلد ہی کرسمس کی تیاری نے ان درختوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور کسی کسی جگہ ان کا وجود بھی چمکنے دمکنے لگتا۔ ہم نے زیادہ تر جرمنوں کو ہی کرسمس مناتے دیکھا ہے۔ کرسمس پر ان کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ تب سنو پڑ جائے، یعنی کچھ برفباری ہو جائے، بقول ان کے انکی کرسمس سفید ہو جاتی ہے۔ اس بات پر ہم پہلے بھی کافی اچنبھے میں رہتے ہیں۔ لگتا ہے گوروں کو سفید رنگ بہت بھاتا ہے۔ انکا شادی کا لباس سفید، انکی عید کا دن سفید۔۔

خیر کینیڈا میں فطرت کے نظارے تو خوب تھے۔ خزاں کا موسم تھا۔ درختوں سے پتے گر کر ادھر ادھر بکھر رہے تھے لیکن صفائی کرنیوالا عملہ بھی اتنا ہی مستعد تھا۔ اور وہ خوب اپنی ڈیوٹی نبھاتے تھے۔ کچرا اٹھانے والی گاڑیاں بھی تقریباً روز ہی دکھائی پڑتی تھیں۔۔۔

فائرالارم اسٹیشن

ٹورنٹو میں ایک چیز ایسی تھی جس سے بعض دفعہ بیٹھے بٹھائے دل دہل جاتا تھا۔ وہ دراصل بالکل قریب ہی گھر کے ایک سائیڈ پر فائرالارم اسٹیشن تھا۔ وہ جب بھی ان کی گاڑیاں وہاں سے نکلتیں تو اتنی تیز فائرالارم بجاتے ہوئے نکلتیں کہ ہم جرمن والے دہل ہی جاتے۔ کیونکہ جرمنی میں یہ گاڑیاں تب ہی نظر آتی تھیں، جب کہیں واقعی خدانخواستہ آگ لگی ہوتی۔ اور یہاں صبح شام انکے الارم بج رہے ہوتے۔ شروع میں تو ہم فوراً یا اللہ خیر، اے اللہ سب کو اپنی امان میں رکھنا، اور دعائی کلمات پڑھنے لگتے۔ بلکہ کئی بار تو گھبراہٹ میں اٹھ کر آگ بجھانے والی گاڑی کو بھی دیکھنے کے لیے کھڑکی کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ کہ کم از کم پتہ تو چلے کہ کس محل ووقوع میں آگ لگی ہے اور گاڑی کدھر کو جارہی ہے۔ تا کہ ہم کوئی دعا پڑھ کر ادھر منہ کر کے پھونک ماردیں۔ بعد میں میزبانوں نے ہماری تسلی کہ ایسی کوئی بات نہیں کہ ہر وقت آگ ہی لگی ہو۔ بس یہ ان کا فائرالارم اسٹیشن ہے۔ اس لیے ذرا یہ حرکت میں رہتے ہیں۔۔

پر جس بات کے لیے ہم خدشے میں تھے وہ سچ مچ ہوگئی۔ ایک بلڈنگ میں واقعی آگ لگ گئی۔ اور جس بلڈنگ کے اپارٹمنٹ میں لگی، وہاں میزبان کے ایک دوست رہتے تھے۔ آگ انکے اوپر والے اپارٹمنٹ میں لگی۔ جسکے اثرات نیچے ان کے اپارٹمنٹ میں بھی آئے۔ اتفاق سے انکی بیوی اور بچہ بھی یہاں نہیں تھے۔ سوان صاحب نے فوراً دوسرا اپارٹمنٹ لے کر دوستوں کی مدد سے گھر کا سامان ادھر منتقل کیا۔ سو بلڈنگ میں رہنے کا یہ نقصان سامنے آیا۔ کہ بعض دفعہ دوسروں کی کرنی باقیوں کو بھی بھرنی پڑ سکتی ہے۔ باقی اللہ تعالی کی امان کی تو ہر جگہ ہی بندے کو ضرورت ہوتی ہے۔ کینیڈا میں کچھ ایسے لوگوں سے بھی ملنا ہوا جو یورپ سے تھے۔ ڈنمارک۔ ناروے، انگلینڈ سے گئے تھے۔ اور اگر کہیں کوئی جرمن مل

جاتے تو اک اور ہی طرح کی اپنائیت ہونے لگتی۔ وہ فوراً اپنی ہسٹری بتانے لگتے کہ کتنے سالوں سے وہ کینیڈا میں ہیں اور جرمنی کے کس شہر سے ان کا تعلق ہے۔ ویسے ایک بات ہے کہ جب ہم کینیڈا جاتے ہیں تو تب ہمارے منہ سے بے اختیار جرمن ورڈز نکل رہے ہوتے ہیں اور جب واپس جرمنی آتے ہیں تو ہماری انگلش ترقی کر چکی ہوتی ہے اور اس بات کا احساس ہمیں جرمنی والے بار بار دلاتے ہیں، کیونکہ ہمارے جرمن الفاظ انگلش میں تبدیل ہو چکے ہوتے ہیں۔ پھر بس کچھ دن ہی لگتے ہیں ہمیں واپس ڈوچ کا عادی ہونے اور اپنے آپے میں واپس آنے کے لیے۔۔۔ گھوم پھر کر آ کر ہم دوبارہ اپنے تکیے سے دوستی کر لیتے ہیں اور اپنی منی لائبریری کو محبوبانہ نظروں سے دیکھتے ہیں اور انھیں چھوڑ کر دوبارہ جلدی کہیں نہ نکلنے کا تہیہ کر لیتے ہیں۔ اور اس کے بعد ہم پھر یا قسمت یا نصیب کے تحت اپنے ہاتھوں کی لکیروں کے آگے بے بس ہو جاتے ہیں۔۔۔

آبشار

نیاگرا فال کی کینیڈا کے لیے وہی اہمیت ہے جو لاہور شہر کی پاکستان کے لیے۔۔ایک دل جتنی اہمیت۔۔بندہ کینیڈا جائے اور نیاگرا فال نہ دیکھے۔نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا کہ اتنے قریب جا کر بھی کوئی اسے دیکھے بغیر لوٹ آئے۔جب پہلی بار کینیڈا جانے کا پروگرام بنا تھا تو عزیزوں،رشتہ داروں سے ملنے کی خوشی اپنی جگہ تھی لیکن دل کہیں کہیں اس خیال سے بھی جھوم رہا تھا کہ اب نیاگرا فال جسے ہم صرف تصاویر میں کینیڈا کی پہچان کے طور دیکھتے تھے،اب روبرو اس کا نظارا ہو گا۔سچ پوچھیں تو کینیڈا سے بھی زیادہ وہ آبشار دیکھنے کے لیے دل اتاولا ہو رہا تھا۔کیونکہ جب پاکستان میں بھی تھے تو کینیڈا کے عزیز اقرباء سے بھی اس کی بہت تعریف سنی تھی۔اس کے قریب جانے پر بارش جیسا سماں اور رات کو اس پر پڑتی روشنیاں اس کی خوبصورتی کو جس نا قابل بیاں حد تک بڑھا دیتی ہیں،یہ باتیں ہمارے اس ان دیکھے اشتیاق کو اور بڑھا رہی تھیں۔۔سو کینیڈا جا کر ہم بس سی این ٹاور اور نیاگرا فال کو دیکھنے کے خواہشمند تھے۔باقی جو میزبان اپنی خوشی سے دکھا دیں وہ ان کی چاہت اور مرضی۔۔۔

سو اب تک دو بار نیاگرا فال دیکھ چکے ہیں۔اور سہ بارہ،چہار بار،پنجم بار،ششم بار،ہفتم بار۔۔۔نہ جانے کتنی بار اور اسے دیکھنے کی خواہش دل میں انگڑائیاں لیتی ہے۔بھئی جب کینیڈا کے رہنے والے اسے دیکھ کر سیر نہیں ہوتے تو ہم کیسے ہو سکتے ہیں؟وہاں کے لوگ تو سال میں کئی کئی بار جا کر اس کا نظارا کر آتے ہیں۔بلکہ وہاں جانے اور اسے اک نظر دیکھنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔اس لیے ہمیں وہ آبشار کسی جادوگرنی کی طرح لگتی ہے جو اپنے قریب آنے والوں پر اک جادو پھونک دیتی ہے۔اسی لیے لوگ اس کی اور بار بار کھنچے چلے جاتے ہیں۔۔۔

پچھلے ٹرپ میں ہمارا نیا گرا فال دیکھنے جانا ماہ جولائی میں ہوا تھا۔موسم کی تیزی کی بدولت شدید گرمی کا سامنا تھا۔ایسے میں کسی آبشار، پانی کے پاس جانے کا خیال ہی بڑا خوش کن تھا۔اور دن کے وقت اس کا دیدار کیا تھا۔سفید جھاگ اڑاتے پانی پہاڑوں سے اتر کر اس آبشار میں گر کر بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔تصاویر میں جن پانیوں کو گرتے ہوئے دیکھتے تھے،وہ تصویر سے نکل کر جیسے ہی مجسم ہوئے تو ہم بھی اپنی جگہ پر ساکت ہو گئے۔قدرت کی ایک اور صناعی ہمارے سامنے تھی۔دن کی روشنی میں سارا منظر عیاں تھا۔سو ہم جی بھر کر تیزی سے بہتے پھسلتے پانیوں کو بغور دیکھ کر اس کا منظر اپنی آنکھوں میں اتار کر اور ڈھیر ساری تصاویر بنا کر جرمنی لے گئے تھے۔اور اس کی سی ڈی بنا کر محفوظ کر چکے تھے۔اور جرمن والے احباب شوق سے ہمارے اس ٹرپ کا حال دیکھتے تھے۔۔۔اور وہ گھر بیٹھے ہی کینیڈا کے فطرت کے نظاروں سے مرعوب ہو جاتے۔ سو اس بار بھی نیا گرا جانا اور دیکھنا لازم تھا۔کیونکہ کینیڈا کا دیکھنے والا متاثر کن نظارا تو بلاشبہ یہی ہے۔ پر چونکہ موسم سرما میں آنا ہوا تو یہ خیال ضرور آتا کہ کہیں برفباری آڑے نہ آ جائے۔لیکن وہاں بہت سے لوگوں کو کرسمس اور نیوائیر پر نیا گرا جانے کا پلان کرتے دیکھا، بلکہ ان کا کہنا تھا کہ نئے سال پر وہاں جانے کا اور بھی مزا آئے گا۔اور ہم دل میں سوچنے لگتے کہ اتنی سردی میں گرم کمرے میں ٹی وی کے آگے بیٹھ کر مزیدار کیک اور مٹھائی کے ساتھ چائے پینے اور دلچسپ باتیں کرنے کے برعکس وہاں جا کر ایسا کیا خاص مزا آنے والا ہے۔کہیں آبشار کے سامنے بیٹھ کر ٹھنڈی ٹھنڈی آئس کریم کھانے کا پروگرام تو نہیں؟ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ ان کا آئیڈیا بڑے کام کا تھا۔سو اس بار سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے اسے دیکھا گیا۔

کرسمس تو اپنی رنگینوں کے ساتھ گزر گئی تھی۔کرسمس سے ایک دو روز پہلے برفباری بھی ہوئی۔جس سے

سے ان لوگوں کی ۔۔سفید کرسمس ۔۔کی دلی خواہش بھی پوری ہوئی ۔پورا دسمبر جس طرح بازار سجے رہے اور مالز میں رونقیں لگی رہیں ۔شاپنگ پلازا سجائے گئے ۔چیزوں اور گفٹس پیک میں نئی نئی ورائٹی آئی ۔ اس سے کرسچیئن کے علاوہ بھی سب لوگ خوب فائدہ اٹھا لیتے ہیں ۔اور کرسمس ،نیو ائیر کے بعد چیزوں پر سیل آفر آنے لگتی ہے ۔سو اس حساب سے دسمبر ،جنوری دونوں ہی شاپنگ کے مہینے لگتے ہیں ۔ہم بھی ٹورنٹو کے شاپنگ مالز دیکھتے رہے ۔کبھی ونڈو شاپنگ کرتے اور کوئی چیز پسند آتی تو فوراً لے بھی لیتے ۔ جرمنی میں کرسمس کے تہوار تو دیکھتے ہی رہتے ہیں ۔لیکن کینیڈا میں پہلی بار دیکھ کر کافی مزا آ رہا تھا ۔کیونکہ یہاں کنیڈین لوگوں کا ساتھ دینے کے لیے ملٹی نیشنل لوگ تھے ۔سو مالز میں بھانت بھانت کے لوگ تھے اور اسی حساب سے ان کی بولیاں تھیں ۔اور لگتا تھا جیسے ہر کوئی خریداری کے لیے ہی نکل کھڑا ہوا ہے ۔ گروسری سٹور بھی بھرے نظر آتے اور قریبی سٹور بھی ۔۔لگتا تھا لوگ کھانے پینے کی چیزیں بھی خوب خرید رہے ہیں ۔حالانکہ دیکھا جائے تو صرف تین دن چھٹی کے ہونا تھے ۔پھر سارا کچھ دوبارا کھل جانا تھا اس کے بعد بس نئے سال کی چھٹی ہونی تھی ۔ہمیں تو فرق اس وقت پڑا ،جب لائبریری ایک ہفتے کے لیے بند کر دی گئی ۔ان چھٹیوں کا فائدہ اٹھا کر بہت سے لوگ امریکہ کرسمس اور نیو ائیر منانے چلے گئے ۔اور کینیڈا میں خاص طور پر ٹورنٹو اور اس کے نواحی شہروں والے لوگ فوراً امریکہ جا کر شاپنگ ایسے کر کے آ جاتے ہیں ،جیسے ٹورنٹو میں ہی گھوم پھر کر شاپنگ کر لی ہو ۔لوگ نیا گرا جا کر وہاں سے بارڈر کراس کرتے ہیں اور امریکہ میں داخل ہو جاتے ہیں ۔کہا جا سکتا ہے کہ کینیڈا اور امریکہ دونوں اچھے پڑوسی ہیں ۔ دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی خار نہیں ،بلکہ معشیت کے حساب سے فوائد زیادہ ہیں ۔اسی لیے ان کے بارڈر بھی دو اچھے دوستوں کی طرح ملتے اور بچھڑتے رہتے ہیں ۔سال کے کسی کسی دن امریکہ کے

باڈر کے ساتھ ملنے والے شہروں میں بہت بڑی اور زبردست پرکشش سیل آفرز لگتی ہیں۔ اور یہاں کے لوگ اسے کسی صورت مس نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ چیزیں کافی سستی کردی جاتی ہیں۔ جس سے ان سٹوروں میں ایک طرح سے لوٹ مار مچ جاتی ہے۔ تب کافی چوری کے واقعات بھی ہوتے ہیں۔ اور چیزوں کو لے کر لوگوں میں لڑائی مار کٹائی اور جھگڑے ہوجاتے ہیں۔ ہائی وے پر رش کی لائنیں علیحدہ لگ جاتی ہیں۔ پھر ٹی وی پر یہ سب نیوز میں دکھایا جاتا ہے۔ سو اس بار ہم نے بھی یہ سب بغور دلچسپی سے دیکھا اور مہذب ملکوں کی مہذب تہذیب دیکھ کر دھیرے دھیرے مسکراتے رہے۔۔

کرسمس کی چھٹیوں کا فائدہ اٹھا کر ہمارے بھی کچھ رشتے داروں امریکہ میں چلے گئے۔ درحقیقت کام، جاب کرنے والے لوگوں کو ہی چھٹیوں کی اہمیت کا ٹھیک احساس ہوتا ہے اور وہ اسے پلان کرتے ہیں۔ خیر، جاتے جاتے وہ ہماری آٹھ جنوری کی دعوت پکی کر کے گئے۔ اور اگلی دعوت پندرہ جنوری کی ہونا تھی۔ اور یہ وہاں پر اس ٹرپ کی آخری دعوت تھی کیونکہ بیس جنوری کو ہماری واپسی کی فلائیٹ تھی۔ سو اللہ کے فضل سے سب اچھا اچھا ہوگیا۔ بس ایک بات پہ کافی حیرانی سی ہوئی کہ وہاں لوگ نیا سال اتنی دھوم دھام سے نہیں مناتے۔ شاپنگ سٹوروں پر نیوائیر کی مناسبت سے پھلجڑیاں، پٹاخے، ہوائیاں سارا کچھ موجود تھا اور وافر نظر آرہا تھا۔ لیکن کسی کو بھی ان چیزوں کی خریداری کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔۔ ہم اس گمان میں رہے کہ شائد کوئی بچہ ہی ان چیزوں کا خریدار نکلے۔ لیکن کہاں جی۔۔۔ پھر حیرانی تو لازم تھی کیونکہ جرمنی میں تو نیا سال خوب دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ اور نئے سال کی آمد کے قریبی دنوں میں چھوٹے، بڑے انھی چیزوں کے خریدار نظر آتے ہیں۔ اور کئی دن پہلے سے ہی پٹاخوں کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ اور نیوایئر پر جرمن لوگ گھروں سے باہر نکل کر خوب پٹاخے چلاتے ہیں۔۔

کہ ہر سٹریٹ میں دھواں ہی دھواں نظر آ تا ہے۔ اور ٹورنٹو میں ہمیں ایک بھی پٹاخہ، ہوائی اور پھلجڑی چلتی نظر نہیں آئی۔ جبکہ ہم یہ نظارا دیکھنے کے لیے رات دو بجے تک جاگتے بھی رہے۔ دور سے ڈاؤن ٹاؤن اور سی این ٹاور بھی نظر آ رہا تھا۔ اس لیے امید واثق تھی کہ اس طرف تو ضرور آتش بازی کا مظاہرہ دیکھنے کو ملے گا، پٹاخے چلیں گے۔ ہم کبھی ایک طرف کی کھڑکی کے پاس جاتے اور کبھی دوسری طرف بالکونی کی طرف لپکتے۔ بھئی آخر جرمن والے احباب کو بھی تو نیوایئر کا آنکھوں دیکھا حال سنانا تھا نا۔۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ میزبان ہماری افراتفری دیکھ کر مسکراتے رہے اور بار بار ہمیں باور کرانے کی کوشش کرتے رہے کہ یہاں ایسا ہنگامہ برپا نہیں ہوتا اور ہو بھی تو بالکل ڈاؤن ٹاؤن میں ہی ہوتا ہے۔ عام پبلک تو آرام سے نیند کے مزے لیتی ہے۔ اگلے دن اٹھتی ہے تو نئے سال میں قدم رکھ چکی ہوتی ہے۔ اور ہم ان کی بات سن کر حیران ہوتے رہے کہ ہیں۔۔ یہ گوروں کی کونسی قسم ہے جو نئے سال کو خوش آمدید نہیں کہتی۔ بلکہ یہاں پر تو دنیا بھر سے لوگ جمع ہیں۔ یہاں تو آتش بازی سے فضا زیادہ قوس قزح کی طرح رنگین ہونی چاہیئے۔ پر دھوم دھام سے کرسمس کی شاپنگ کرنے اور منانے والے لوگ سستی کے مارے گھروں میں ہی سوئے پڑے رہے۔۔۔

نیاگرا

جس طرح ایک جھیل کے نام پر کینیڈا کے صوبے کا نام ۔۔انٹاریو۔۔رکھا گیا تھا۔بالکل اسی طرح نیاگرا شہر کے نام پر مشہور زمانہ آبشار۔۔نیاگرا فال۔۔کا نام بھی رکھا گیا ہے۔

اور یہ نیاگرا شہر ٹورنٹو سے ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر ہے، جو تقریبا نوے میل کی دوری پر ہے۔اس تک جانے کے لیے سیدھا اور نہایت ہی خوبصورت راستہ ہے۔اور اس پورے راستے میں جگہ جگہ ٹھہرنے کے انتظامات ہیں۔ٹورنٹو اور اس کے گردونواح علاقوں اور شہروں کے مکینوں کے لیے تو یہ زیادہ فاصلہ نہیں۔البتہ دور دراز شہروں سے آنے والے شائقین اگر چاہیں تو اپنے سفر کو انجوائے کرتے ہوئے راستے میں جگہ جگہ بنے سپاٹ پر رک سکتے ہیں۔اطمینان سے کچھ کھا پی سکتے ہیں اور پھر اپنا سفر جاری رکھ سکتے ہیں۔اور نیاگرا جانے کے راستے میں ہی ایک کافی بڑا سارا شاپنگ ایریا بھی واقع ہے۔پچھلی بار کے ٹور میں وہاں جانا ہوا تھا۔اور گرمی کی شدت سے بے حال ہوتے ہوئے منزل پر پہنچنے سے پہلے ایک بار رک کر تازہ دم ہونا ضروری سمجھا گیا تھا۔اور دوسرا وہیں ایک شوز والی دوکان سے ہم نے اور میزبان خاتون نے سوفٹ سے جوتے بھی خریدے تھے۔سو تفریح کے لیے جاتے جاتے بھی شاپنگ آڑے آ گئی تھی۔ لیکن وہ جوتے تب کی سیر و تفریح میں بڑے کام آئے تھے۔۔

نیاگرا شہر کو یہ اہمیت بھی حاصل ہے کہ یہاں امریکہ اور کینیڈا کی سرحدیں ایک دوسرے کے گلے ملتی ہیں۔ویسے تو یقیناً اور بھی کئی مقامات ہیں، جہاں انکے باڈر ملتے رہتے ہیں۔لیکن اس سلسلے میں نیاگرا کو ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ایک پنتھ دو کاج والا معاملہ بھی ہو جاتا ہے۔لوگ آبشار دیکھنے آتے ہیں اور وہیں ساتھ ہی امریکہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔امریکہ اور کینیڈا کے باہمی تعلقات خوشگوار ہیں اور سنا

ہے کہ دونوں کے باسیوں میں کافی مشابہت اور مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ ہاں بھئی خربوزے کو دیکھ کر خربوزا رنگ پکڑ ہی لیتا ہے۔ اس بار نیاگرا فال دیکھنے کے لیے رات کا وقت طے کیا گیا تھا۔ سواس شام پہلے برلنگٹن میں ایک مزیدار دعوت کھائی اور پھر آگے کے لیے روانہ ہوئے۔ اس راستے پر جاتے ہوئے کافی صنعتی ایریا بھی محسوس ہوا۔ فرانس کی میک اپ کی لوری آل کمپنی کے پاس سے بھی گزرے اور باقی راستے میں بھی بہت سی فیکٹریاں آتی رہیں۔ کیونکہ شام کے وقت جانا ہوا تھا۔ تو جگہ جگہ دھوئیں کے بادل چھوڑتیں بڑی بڑی چمنیاں نظر آتی رہیں۔ گویا فطرت کے ساتھ ساتھ پلوشن کا ساماں بھی موجود تھا۔۔

کرسمس گزر چکی تھی اور نئے سال کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔ لیکن ہمیں ابھی بھی جا بجا لوگوں کے گھر روشنیوں سے سجے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ہائی بلڈنگز کے علاوہ نواحی شہروں میں لوگوں کے ذاتی گھر ٹمٹماتے قمقموں سے لشکارے مار رہے تھے کہ ہمیں میزبان سے پوچھنا ہی پڑا،

:بھئی، کیا یہ گھر پورا سال یوں ہی جگمگ جگمگ کرتے رہیں گے۔:

تو جواب ملا،

:نہیں۔۔ پورا سال تو نہیں البتہ پوری جنوری یونہی رہیں گے۔ پھر لوگ بادل نخواستہ لائٹنگ اتار لیں گے۔: میزبان نے جواب دیا۔

ویسے تو فطرت یہاں ہر طرف جا بجا پھیلی ہوئی ہے لیکن نیاگرا میں داخل ہوتے ہی مزید قدرتی نظارے سامنے آنے لگتے ہیں۔ جوں جوں شہر قریب آتا محسوس ہوتا ہے۔ دل کی کیفیات بھی کچھ اور ہونے لگتی ہیں۔ منزل پر پہنچنے کی خوشی تو ہوتی ہی ہے، لیکن یہاں دل کی کچھ عجب سی حالت محسوس ہوتی ہے۔ جیسے یکدم ساقی کو میخانے نے اپنی اور کھینچنا شروع کر دیا ہو۔۔

نیا گرا پہنچے تو دیکھا کہ واہ، کیا سماں تھا کیا نظارا تھا اور ہم تھے۔ رات کے وقت روشنیوں کا اک طوفان تھا جو امڈا چلا آ رہا تھا۔ کرسمس اور نیو ائیر دونوں نے ہاتھ ملایا تھا۔ اور روشنیوں کا سنگم ہو گیا تھا۔ شہر کے اندر داخل ہوتے ہی بہت سی گلیاں بازار اور چوک نظر آنے لگے تھے۔ آگے پیچھے بہت سی سڑکیں تھیں اور جو عنصر زیادہ نمایاں ہو رہا تھا وہ وہاں کے ٹاورز تھے۔ لگتا تھا کسی ٹاور والے جنگل میں گھس گئے ہیں۔ کوئی کسی طرح کا اور کوئی کسی اور شکل کا، ہر ایک کی علیحدہ ہیئت۔۔ جن کے اندر لفٹیں نصب ہیں، جو اوپر نیچے آ جا رہی ہیں۔ چونکہ کرسمس اور نیو ایئر کے تہوار ابھی ابھی ہی گزرے تھے، سو نیا گرا میں بھی اک میلے کا سا منظر نظر آیا۔۔ سجاوٹ سے معمور ٹاوروں کے ساتھ ساتھ وہاں اونچے اونچے جھولے، اک خلقت کا ہجوم، دوکانیں، رونق، افراتفری، کھانے پینے کی اشیاء کی دوکانیں سب سردی کو مات دے رہے تھے۔ ابھی اصل حاصل تو پیچھے پنہاں تھا۔ پہلے تو یہی سب کچھ اپنی جانب خوب متوجہ کر رہا تھا۔ کھانے پینے کی دوکانیں، ریستورانوں سے کھانے کی خوشبو آتی محسوس ہو رہی تھی۔ حالانکہ ابھی ابھی تو آدھ گھنٹہ پہلے عزیزوں کے ہاں سے اک زبردست دعوت کھا کر نکلے تھے۔ اس کے باوجود یہ خوشبوئیں اپنا آپ منوانے پر تلی ہوئی تھیں۔ رات کے دس بجے کا وقت تھا اور یہاں کھانے پینے کا سلسلہ عروج پر لگ رہا تھا۔ ویسے کیا کمال لگ رہا تھا۔ لوگ پیٹ پوجا کر کے ریستوران سے نکلتے تھے اور آسماں کو چھوتے اور لہراتے جھولے پر جا کر بیٹھ جاتے تھے۔۔

یہیں پر ہی سب سے بلند ٹاور۔۔ پینو سانک ٹاور۔۔ موجود ہے۔ کہتے ہیں اس ٹاور کی چوٹی سے امریکہ اور کینیڈا کے قریبی شہر دکھائی دیتے ہیں۔ قدرت نے اپنے خزانے سے زمین کے اس خطے پر بہت خوبصورتی لٹائی ہے۔ اور کینیڈا والوں کے حصے میں یہ نعمتیں کافی وافر مقدار میں آئی ہیں۔ اور نیا گرا

چوک تو بالکل اک عجائب خانوں کی طرح نظر آیا۔ پر تجسس، پر ہیبت۔۔ ایک طرف او نچے او نچے روشنی سے سجے جھولے اور دوسری طرف اس چوک میں مختلف عجائب خانے سے۔۔

ہم کار سے باہر نکلے اور فوٹو بنانے لگے۔ ایک طرف دلکش نظارے تھے اور دوسری طرف بھول بھلیاں بنی تھیں۔ اور ہم ان میں سے کسی کو بھی کھونا نہیں چاہتے تھے۔ عجائب گھروں کے اوپر بنے بورڈ نے ہی کافی حد تک اندر کی کہانی بیاں کر دی تھی۔ سو اسے دیکھتے ہوئے اور اپنے کیمرے میں مقید کرتے ہوئے ہم آگے بڑھ گئے۔ اسوقت اک اور ہی کشش اپنی طرف کھینچے جا رہی تھی اور ہم بھی اپنی پیاس جلد بجھانا چاہتے تھے۔۔

نیاگرا شہر میں دریا بھی ساتھ ساتھ ہی چلتا محسوس ہوتا ہے۔ سو ہم اور تھوڑا سا آگے بڑھے تو دریا کے کنارے موجود بجلی کے گھنٹہ گھر جا پہنچے۔ یہ ایک بہت بڑا اور اونچا گھنٹہ گھر ہے۔ اسے دیکھ کر ہمیں فیصل آباد کا گھنٹہ گھر یاد آ گیا۔ جو فیصل آباد میں سب کی زبان زد رہتا ہے۔ کسی کو ایڈریس سمجھانا ہو تو یہ ضرور بیچ میں چلا آتا ہے۔ اور ایک یہ، جو اس کے مقابلے میں بہت بڑا اور خاص گھنٹہ گھر ہے۔ کہتے ہیں کہ کینیڈا کے بڑے بڑے انجینئروں نے اسے زمین کے سینے پر بنایا ہے اور اس کے ارد گرد ایک مصنوعی جھیل بھی بنا دی گئی ہے۔ یہ کلاک خود کار ہے اور یہاں بھی ہر وقت اس کے شائقین کا ہجوم سا رہتا ہے۔ اس کے ارد گرد کا ایریا بھی خوب ہے۔ جیسے بندہ کسی پلازہ میں داخل ہو جائے۔ گھنٹہ گھر کے ایک طرف بڑا سا پب ٹائپ خزینو بھی موجود ہے۔ جہاں بہت سے لوگ اندر جاتے اور اپنا شوق پورا کرتے دکھائی پڑتے ہیں۔ یقیناً اس میں داخل ہونے والے لوگ۔۔ لاکھ سے خاک اور خاک سے لاکھ۔۔ کا کھیل کھیلتے ہیں اور اس طرح اپنی قسمت آزمائی کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف بڑی بڑی دکانیں موجود ہیں۔۔

پلازہ سابنا ہے اور درمیانی جگہ پر خوبصورت سے درخت قمقموں سے سجے ہوئے تھے۔ ماحول بڑا ہی اچھا لگ رہا تھا۔ ہم نے وہاں واک کی طرح کئی چکر لگائے۔ حالانکہ اس جگہ کی اصل خوبصورتی تو گھنٹہ گھر سے ہی منسوب ہے۔ اس کلاک کے اطراف بنی جھیل کے کنارے بیٹھ کر ہر کوئی تصاویر کھنچوانا چاہتا ہے۔ سو ہم کیسے پیچھے رہتے، ایک فوٹو شوٹ یہاں بھی ہوا۔۔

بھئی آخر، جرمنی کے دوست احباب کے لیے کوئی یادگار نشانی بھی تو لے کر جانا ہے نا تو اس نشانی کے لیے بنفس نفیس ہم موجود تھے نا۔ اور اکثر میزبان اور دعوتوں کے میزبان ہمیں بھی اک نشانی سمجھ کر اپنے کیمرے میں محفوظ کر لیتے اور ہم مسکرا کر فوٹو شوٹ کروا دیتے۔ کہ آخر اگلے چکر تک ہماری تصاویر ہی ان کی دل بستگی کا ساماں ہوں گی نا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہمارے کیمرے میں منظر سے زیادہ پس منظر فوکس ہوتا ہے۔ تو جہاں بیٹھ کر ہم نے تصاویر اتروائیں اس پانی میں لوگ سکے بھی پھینکتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ عجیب بات ہے لوگ ماڈرن سوچ، وقت کے ساتھ چل کر، پریکٹیکل ہو کر بھی کبھی کبھی ایسی دقیانوسی باتوں پر یقین کرتے ہیں اور ان پر عمل بھی کرتے ہیں۔ اور مزے کی بات کہ ان سکوں کو کوئی بھی نکال کر نہیں لے جاتا۔ اور کہتے ہیں کہ یہ سکے سالوں سال وہاں پڑے رہتے ہیں۔ سکے ڈالنے والے بھی سکے ڈال کر آرام سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کسی کی خواہش پوری ہوتی ہے اور کسی کی نہیں۔۔ یہ رزلٹ انھیں گھر بیٹھے مل جاتا ہے۔ اور ہمیں وہ سکے لوگوں کی خواہشات اور ان کے ارمان نظر آ رہے تھے۔ جو جابجا بکھرے ہوئے تھے۔ گھنٹہ گھر کے اردگرد کی جگہ ایک تفریح گاہ بن چکی ہے۔ اور اپنے آپ میں ایک خوبصورت جگہ بن گئی ہے۔ بیشمار پھولوں کے تختے جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ ویک اینڈ پر یہاں کافی رونق ہوتی ہے۔۔

نیاگرا کی ایک خاص بات یہاں کے ہوٹل بھی ہیں۔ جو کافی تعداد میں بنے ہوئے ہیں۔ یہ سیاحت کرنے والوں کے لیے ایک خاص جگہ تو ہے ہی، لیکن کینیڈا کے رہنے والوں کے لیے بھی یہ اک پر کشش جگہ ہے۔ اکثر لوگ اپنی لائف کے خاص دن وہاں جا کر گزارنا چاہتے ہیں۔ جیسے لوگ اپنے ہنی مون ٹرپ کے لیے یہاں آنا پسند کرتے ہیں۔ اور آبشار کے سامنے بنے ہوٹلوں میں قیام کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور اگر انھیں ہوٹل میں فال کے سامنے والا ویو مل جائے تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ پھر شادی کی سالگرہ ہو یا کوئی دوسرا خاص موقع اکثر میزبان اپنی خوشی میں شریک کرنے کے لیے اپنے احباب کو نیاگرا کے ریسٹورنٹ میں مدعو کرتے ہیں اور شرکاء بھی بہت شوق سے وہاں آتے ہیں۔ کیونکہ انھیں اصل کے ساتھ سود بھی نیاگرا فال دیکھنے کی صورت ملتا ہے۔۔

نیا گرا فال

نیا گرا کی نگری میں داخل ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی لیکن ابھی بھی منزل مقصود پر پہنچنا باقی تھا۔
ابھی ہم کائنات کے باقی کرشمے دیکھنے میں مگن تھے۔روشنیوں میں ہر چیز اپنی جلوہ نمائی پیش کر رہی تھی۔
اور ہم ان سے اپنی نگاہیں سیر کر رہے تھے۔آج کی رات ہم اپنے دل کی سلامی لینے کی بجائے نیا گرا کی
نذر کر دینا چاہتے تھے۔ایک ایک منظر اپنی آنکھوں میں سمولینا چاہتے تھے۔تا کہ دل میں کوئی حسرت باقی
نہ رہے۔اور جرمنی پہنچ کر بھی جب دل چاہے انھی یادوں میں جھانک سکیں اور انھیں تازہ کر سکیں۔بالآخر
چلتے چلتے اس مقام پر پہنچ ہی گئے۔جسے اک بار پھر دیکھنے کی خواہش دل میں لے کر چلے تھے اور نیا گرا
کے پانیوں کا تصور کرتے ہوئے جہاز میں قدم رکھا تھا۔ قدرت کی اک اور بڑی صناعی کو پھر آنکھوں
میں سمولینا چاہتے تھے۔یہ دنیا لوگوں اور کائناتی رنگوں سے بھری پڑی ہے۔سو انھیں دیکھنے کے کچھ شوقین
کوہ نوردی میں نکل جاتے ہیں اور پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر انھیں جو محسوسات حاصل ہوتے ہیں۔وہی
نیا گرا فال دیکھنے والے کے دل پر بھی یقیناً اترتے ہیں۔۔

اس رات موسم سرد تھا اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔رات کے گیارہ بج رہے تھے اور ہلکی سی پھوار بھی
پڑ رہی تھی۔ سب سے پہلے رنگوں میں نہائی ہوئی آبشار دکھائی پڑی۔ ایک طرف جگمگ جگمگ کرتی
روشنیوں سے فضا بھری ہوئی تھی۔اور دوسری طرف سامنے امریکہ کی بڑی بڑی عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔
رب ذوالجلال کی قدرت سامنے تھی اور اس کے بندوں نے ماحول کو خوبصورت بنانے کی اپنی سی کوشش
کی تھی۔ عام حالات میں تو ممکن ہے کہ رات کا ہی پہرا ہوتا۔لیکن ان دو تہواروں کے نام ہوئی روشنیوں
نے دور تک کا منظر عیاں کر دیا تھا۔ بلکہ اندھیرا منہ چھپائے پھر رہا تھا۔ان مناظر کو دیکھنے والے جیسے کھو

جاتے تھے۔ کینیڈا والے حصے میں آبشار، ہوٹلز، بڑی بڑی عمارتیں، جھولے اور میلے کا سماں اپنی رنگینی لیے ہوا تھا اور سامنے امریکہ کی بڑی بڑی بلڈنگز پر بھی کمال کی لائٹنگ کی گئی تھی کہ موازنہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ہر بات تعریفی بیان سے باہر لگ رہی تھی۔ سامنے امریکہ کی ایک بڑی بلڈنگ پر تو نیاگرا فال کا ہی نقشہ بنایا گیا تھا۔ ایک بڑی آبشار بہتی دکھائی گئی تھی یعنی آبشار کے سامنے آبشار۔۔ اس خیال اور عمل پر بے اختیار داد دینے کو دل چاہا۔ ہم نے بھی اپنے کیمرے میں اس منظر کے خوب کلوز اپ لیے۔ اور بعد میں جب بھی انھیں دیکھا تو دل بہت خوش ہوا کہ اک قیمتی منظر مقید کر لیا۔ امریکہ کو اپنے اتنے قریب دیکھ کر دل مچل رہا تھا کہ اسے بھی جا کر ہاتھ لگا کر دیکھ ہی لیں۔ لیکن دل کو اگلی بار کی تسلی دے کر سمجھانا پڑا۔۔

ہر طرف فضا اتنی رنگین ہو رہی تھی کہ اوپر نظر کرنے پر بھی ہر طرف رنگوں کے بادل سے لہراتے محسوس ہوئے اور جب ان روشنیوں کے سحر کے عادی ہوئے تو فال دیکھنے کے لیے آگے بڑھے۔ چنگھاڑتے ہوئے پانیوں کی آواز تو اس منظر میں داخل ہوتے ہی کانوں میں پڑنے لگی تھی۔ دل کے دہلانے کو خیال برا نہ تھا۔ اور تب دل بے اختیار کہہ اٹھا،

:اے مسافر، مسافت تمام ہوئی۔ اور وہ شاہکار سامنے ہے، جس کے لیے یہ آبلہ پائی ہوئی۔:

موسم کی شدت کی وجہ سے میزبان نے بچوں کو یہ کہتے ہوئے گاڑی میں ہی مقید رکھا کہ،

: ہم تو ویسے بھی سال میں دو چار مرتبہ نیاگرا فال دیکھ ہی لیتے ہیں۔:

تو میں دل میں مسکانے لگی کہ ہاں جی آپ کے گھر کی جو ہوئی۔ رات کے گیارا بجے کا وقت تھا۔ بہت سی گاڑیاں سامنے روڈ کے کنارے بھی کھڑی تھیں۔ سو ہم بڑے ممبران ہی گاڑی سے باہر نکلے۔ اور ہلکی سی پڑتی ہوئی پھوار میں چلتے ہوئے آبشار کے قریب چلے گئے۔ میرا خیال ہے اسے آبشار کہنا زیادتی ہے۔

کیونکہ وہ تو اک مدھر سی سبک رفتاری سے ہلکے سر میں گنگناتی پہاڑ سے اتر کر جھرنا بن کر بہتی چلی جاتی ہے۔ جس کے کنارے کھڑے ہو کر خود کو بھگو کر گایا جا سکتا ہے۔

او نیلے پربتوں کی دھارا آئے ڈھونڈ لے کنارا

بڑی دور سے سب کو سہارا چاہیے کوئی ہمارا چاہیے

اور اس آبشار کی آواز سن کر تو دل دہلایا جا سکتا تھا۔ گو کہ اس کے پانیوں پر پڑتی روشنیوں نے اپنا سحر پھونک رکھا تھا۔ خوب رنگین پانی بہہ رہے تھے۔ نیلے، جامنی، ہرے، گلابی۔۔ مگر نیچے دیکھتے ہی اک خوف کی لہر بھی محسوس ہوتی تھی۔ جہاں آبشار گرتی ہے۔ وہاں لوہے کا اک مضبوط جنگلہ بھی بنایا گیا ہے۔ اور چھٹی والے دن اس جنگلے کے گرد اتنے سحر زدہ لوگ موجود ہوتے ہیں کہ بعد میں آنے والوں کو آگے بڑھ کر دیکھنا بھی محال ہوتا ہے۔ روڈ کے ساتھ ہی پیچھے ہوٹل بھی بنے ہوئے ہیں۔ اور جن پر چند سیڑھیاں اوپر چڑھ کر ان کے ٹیرس پر بھی فال بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔ وہاں سے جیسے اک نیا منظر رونما ہونے لگتا ہے۔ لوگ بہت فوٹو گرافی کرتے ہیں۔ ویڈیو کیمرا سے اس کی ویڈیو بناتے ہیں۔ فال سے پہلے بالکل زمین کی سپاٹ سطح پر تیز رفتاری سے پانی بہتا نظر آتا ہے۔ ان پانیوں میں بھی اتنی زیادہ روانی ہے کہ بندہ ساکت ہو کر پلک جھپکے بغیر اسے دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس وقت دور دور تک یہ پانی سبز رنگت میں نظر آتا ہے۔ یقیناً پتھروں کے نیچے موجود کائی سے اس میں یہ عکس پیدا ہوتا ہے۔ گو یہ پانی تیز رفتاری سے بہتا چلا آ رہا ہے لیکن ابھی یہ خاموش پانی ہے۔ جو اپنے اندر نہ جانے کتنے طوفان لیے چلا آ رہا ہے۔ اور قریب آ کر یہ پانی اس قدر زور و شور سے آبشار کی صورت فال کی گود میں گرنے لگتا ہے۔ کہ وہ نغمے جو دھیرے سے گنگنا رہے تھے۔ یکدم پر شور ساز و آواز کے طوفان میں بجنے لگتے ہیں۔ اور

ہم نے دیکھا کہ یہی وہ مین جگہ ہے جہاں کھڑے ہو کر ہر کوئی قریب سے اس کا نظارا کرنا چاہتا ہے۔ دن میں یہ پانی سفید دودھ کی دھاروں جیسے نظر آتے ہیں۔ اور جیسے ہی یہ پانی نیچے گرتا ہے تو آبشار کی دھاریں رنگ بدلنے لگتی ہیں۔ کبھی آسمانی، کبھی نارنجی اور سورج نکلا ہو تو مزید رنگ بھی اس میں منعکس ہو کر خوبصورتی بکھیرنے لگتے ہیں۔ اور خود بخود ہی آبشار کے اوپر مختلف رنگوں کی قوس قزح بن جاتی ہے اور اس منظر کو مزید گویائی ملنے لگتی ہے۔ یقیناً یہ اتنی بڑی آبشار اور اس پر بنتی رنگ برنگی پینگیں قدرت کی کائناتی دنیا کے کرشمے ہی تو ہیں۔ جو کینیڈا والوں کے حصے میں آئے ہیں۔ نظر اٹھا کر دیکھیں تو پانیوں کے پار سامنے امریکہ کی سرزمین نظر آتی ہے۔ امریکہ کے حصے میں اس آبشار کا صرف ایک چوتھائی حصہ ہی آیا ہے۔ جو اتنا قابل توجہ نہیں لگتا۔ اصل خوبصورتی، حسن تو کینیڈا والوں کے پاس آیا ہے۔ اس لیے جب ہم سے عزیز اور دوست احباب پوچھتے تھے،

:آپ کو ہمارا ملک کینیڈا کیسا لگا؟

تو ہم جرمنی کو صاف بچا لے جاتے اور ڈپلومیسی والا جواب دے دیتے کہ،

:بھئی آپ لوگوں کے پاس تو وہ چیز ہے، جو امریکہ کے پاس بھی نہیں؟

تو حیرانگی سے پوچھا جاتا،

: اچھا وہ کیا۔۔؟

:بھئی آپکے پاس نیا گرا فال ہے۔ کیا اتنی بڑی اور نایاب چیز ہے امریکہ کے پاس۔۔؟: ہم اطمینان سے جواب دیتے۔

:ہاں یہ تو بات تو ہے۔:وہ فوراً قائل ہو جاتے۔

پہاڑوں سے اترتے یہ پانی جب تندی کے ساتھ اتنی بلندی سے گرتے ہیں تو پانیوں میں اک ہلچل مچ جاتی ہے۔تو سب سے پہلے تو سفید دودھیا بوندوں کا ایک گولہ سا اوپر آسمان کی اور اوپر اٹھتا ہے۔لگتا ہے کسی ایکشن کا فوری ری ایکشن ہوا ہے۔اوراس وقت یہ کسی بادل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔آبشار کے قریب والی زمین کی مٹی دن بدن نرم بھربھری پڑتی جارہی ہے۔جس کی وجہ سے اس کا دہانہ وقت کے ساتھ بڑا ہوتا جارہا ہے۔دن کو اسے دیکھنے والے اور ہی روپ میں دیکھتے ہیں۔سفید دودھیا نہریں اور جھاگ اڑاتے پانی دیکھنے والوں پر اثر ڈالتے ہیں اور رات ہوتے ہی اس کی سج دھج میں اور رنگینی آجاتی ہے۔تو لوگ اسے دن اور رات دونوں تناظر میں دیکھنا چاہتے ہیں۔اسی لیے اس بار ہم نے اسے رات کے وقت دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔تا کہ رات کو بھی اس کیا جلوہ دیکھا جاسکے۔ایک مناسب فاصلے سے آبشار پر روشنیاں پھینکی جاتی ہیں اور یہ ہولی کھیلنے لگتی ہے۔دور سے اس کے پانی مختلف رنگوں میں لہروں کی صورت نیچے گرتے محسوس ہوتے ہیں۔اور کبھی یکے بعد دیگرے مختلف رنگ اس پر اترتے ہیں اور ماحول میں فسوں بڑھ جاتا ہے۔یہ مقام سیاحوں کی آماجگاہ ہے۔جو یہاں نیا گرا کے پانیوں کے قریب آتے ہیں۔اور رات گزارنے کے لیے پہلو میں ہی ہوٹل میں ٹھہر جاتے ہیں۔اور چھٹی کے روز مقامی اور دوسرے شہروں سے بھی لوگ آنے لگتے ہیں۔یوں یہاں بہت رش ہو جاتا ہے کیونکہ یہ ایک مکمل تفریح گاہ ہے۔جہاں بازار،ہوٹل،ریسٹورنٹ،عجائب خانے،اونچے اونچے بلند ٹاور،بچوں کے جھولے اور تفریحی کھیل موجود ہیں۔سو چھوٹے بڑے افراد اور سیاحوں کو یہ کھینچ لانے والی جگہ ہے۔۔

نیا گرا فال دیکھنا اور اس کے غضبناک پانیوں کو غصے میں دیکھنا کافی مضبوط دل گردے کا کام ہے۔ بلکہ ہماری طرف سے تو مشورہ ہے کہ وہاں داخل ہونے سے پہلے ہی لکھ کر لگا دیا جائے۔کہ کمزور دل

حضرات, ذرا دھیان سے۔۔۔

آبشار کے اندر ایک موٹر لانچ بھی چلتی ہے۔ جو اس مقام کے بہت قریب جاتی ہے، جہاں اوپر سے پانی گرتے ہیں اور اک طوفان برپا ہوتا ہے۔ نہ جانے یہ خودکی خودی کو آزمانے کا کونسا طریقہ ہے جو دل گردے والے لوگ اس لانچ میں جا بیٹھتے ہیں۔ گو انھوں نے لائف جیکٹیں پہنی ہوتی ہیں۔ لیکن ہمیں یہ سمجھ نہیں آیا کہ وہ پانی کے اتنے قریب جا کر اس سے چھیڑ چھاڑ کیوں کرنا چاہتے ہیں۔؟ یا پھر اوپر ریلنگ کے پار کھڑے مہربانوں پر اپنی بہادری کے جھنڈے گاڑنا چاہتے ہیں۔۔

میزبان بتا رہے تھے کہ اکثر آبشار کے پانی بارش کے چھینٹوں کی مانند باہر دور تک جا گرتے ہیں۔ اور جنگلے کے قریب کھڑے لوگ بھیگ جاتے ہیں۔ اس لیے کئی لوگ ان متوقع بوندوں سے بچنے کے لیے برساتی پہن کر آتے ہیں۔

رات کا سماں، ہلکی سی بارش کی پڑتی پھوار، نیاگرا کے پانی اور روشنیوں کے طوفان۔۔ ہم ہر سمت سے اس منظر میں سمو چکے تھے۔ اور آس پاس کا سب نظارہ شوق سے دیکھ چکنے کے بعد اب ریلنگ کے پاس اس پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے۔ نیچے پانیوں میں دیکھتے ہوئے کچھ تجسس اور خوف کی ملی جلی کیفیت :یہاں سے تو لاکھوں ٹنوں پانی گزر چکا ہوگا۔ اس کے لیے تو میں اک تنکے برابر ہوں گی۔:

میں گہرے شور مچاتے جھاگ اڑاتے پانیوں میں دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ اور رات کے اندھیرے میں اسی موٹر لانچ کو غیر ارادی طور ڈھونڈ رہی تھی۔ جس پر دن میں لوگ بیٹھ کر اس کے بالکل قریب جا کر اپنی بہادری اور جرات کو آزما کر آتے ہیں۔ ابھی میری آنکھیں اس منظر سے روشناس ہونے کی کوشش کر رہی تھیں کہ اچانک میزبان نے راجو گائیڈ کے فرائض انجام دینے شروع کر دیئے۔

:ابھی پچھلے سال ہی یہاں سے ایک جاپانی لڑکی نیچے فال میں گر گئی تھی۔:

:اوہو۔۔کیسے گر گئی۔کیا ہوا، بچ گئی۔؟ میں نے مدہم سی امید کے ساتھ فوراً پوچھا

وہ جواباً بولے

:نہیں جی، اتنی بلندی اور اتنے گہرے پانی میں گر کر بچنا ناممکن تھا۔لیکن بعد میں اس کی باڈی تلاش کر لی گئی تھی۔:

ان کی بات سن کر بہت افسردگی محسوس ہوئی۔ یکدم خاموشی سی طاری ہوگئی اور آبشار کچھ پر ہیبت لگنے لگی۔ پھر وہ خود ہی مزید بتانے لگے،

:وہ لڑکی جاپان سے آئی تھی۔یہاں سٹوڈنٹ تھی۔اپنے گروپ کے ساتھ نیاگرا فال دیکھنے آئی تھی۔فوٹو کھینچ رہی تھی۔اور جس طرح سٹوڈنٹ فوٹو بناتے ہوئے تھوڑا لاپرواہ، جذباتی سے ہوجاتے ہیں، ویسے ہی وہ بھی ریلنگ سے ذرا آگے ہو کر فوٹو بنا رہی تھی کہ اپنا بیلنس برقرار نہ رکھ پائی اور نیچے پانی میں جا گری۔:

تفصیل سے یہ سب سن کر اور افسوس ہوا۔ایک پل کو ایسا لگا جیسے یہ سب ایسے ہی ہونا تھا۔کہ وہ تعلیم کے بہانے یہاں آئی اور اپنی زندگی اس طرح یہاں آکر ہار دی۔ یہ گھڑی، وقت اور جگہ طے تھی۔۔

پھر غالباً اس افسوسناک واقعے کا اثر زائل کرنے کے لیے وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔

نیاگرا فال کے قرب و جوار کے سجے سجائے ایریا میں ابھی بھی جگہ جگہ رونق تھی۔لوگ سردی اور خنکی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بے نیاز سے پھر رہے تھے۔رات کی تاریکی کو بھلا کر چکا چوند روشنیوں کے ماحول میں ڈوبے ہوئے تھے۔ نئے سال کے لمحوں کو اپنی مسرتوں سے کشید کر رہے تھے۔ گویا انہیں بخوبی اندازا

تھا کہ یہ گھڑی پھر جلد نہیں آنے والی۔۔اور ان ساعتوں کے لیے انہوں نے پورا سال انتظار کیا تھا۔
رات مزید ڈھلنے لگی تو ہماری وہاں سے واپسی ہوئی۔ایک اور ہنگامے والا دن گزر چکا تھا۔۔۔
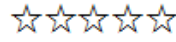
قرب و جوار

ٹورنٹو شہر کے بارے اندازہ تو پیئرسن انٹرنیشنل ائر پورٹ سے باہر آتے ہی ہونے لگتا ہے۔ بڑی بڑی عمارتیں، کھلی کھلی سڑکیں، نئے نئے پلازے، اچھا موسم اور دھوپ نکلی ہو تو ہر طرف اک روشن نظارہ جیسے منتظر ہوتا ہے۔ جس وقت پائلٹ جلد منزل مقصود پر پہنچنے اور زمیں پر اترنے کی نوید دیتا ہے۔ تو سمجھ لیں کہ جہاز اب ٹورنٹو کے اوپر پہنچ گیا ہے اور اب وہ آہستہ آہستہ ہچکولے لیتا نیچے آنے لگتا ہے۔ منزل کے قریب پہنچنے کی چاہ میں دل بھی دھک دھک کرنے لگتا ہے۔ اس وقت ہی جہاز کی کھڑکی سے بڑی بڑی بلڈنگز نظر آنے لگتی ہیں تو ٹورنٹو شہر نظر آنے لگتا ہے۔ یہ اونچی اونچی بلڈنگز اور عمارتیں ہم نے کوئی پہلی بار تو نہیں دیکھی تھیں جو مرعوب ہو کر رہ جاتے۔ بلکہ دنیا میں جدھر بھی نکلے، جس شہر اور ملک بھی نکلے۔ لوگوں کے ساتھ ساتھ وہاں کا رہن سہن، گھر، عمارتیں بھی خوب غور سے دیکھیں۔ جرمنی میں بھی بہت بلند و بالا اور اونچی اونچی کئی منزلہ بلڈنگز ہم فرینکفرٹ میں دیکھ چکے ہیں۔ ہمبرگ میں البتہ ہمیں عمارتوں میں ایک کلاسک ٹچ نظر آیا۔ ایک نظر دیکھتے ہی پتہ چل جائے کہ کہانی کتنی پرانی ہے۔۔ لیکن بنانے والوں نے دل لگا کر فرصت سے یہ شاہکار بنائے ہیں۔ ان کی تعمیر میں پھول بوٹے بھی وافر مقدار میں ٹکائے ہیں۔ اور کہیں کہیں ان کا بھی انداز تعمیر مغلوں سے لیا جالی اور پھول، بیل بوٹوں والا ہے۔ اگر اس سے بھی بڑھ کر انھوں نے مزید کچھ کام دکھانا ہے تو گھر کے مین گیٹ پر شیر بنا کر کھڑا کر دیں گے۔ کہ بندہ شیر دیکھ کر ہی مکینوں کی عادات اور ذوق سے مرعوب ہو کر رہ جائے۔

اسی طرح انگلینڈ میں گلاسگو اور ایڈنبرا بھی تاریخی شہر ہیں اور وہاں کے انداز تعمیر میں بھی کلاسک انداز نمایاں رہا۔ ہمیں وہ شہر بہت گنجان لگے۔ لوگوں کی طرح عمارتیں بھی وہاں رش کی طرح لگیں۔۔

پھر بڑے بڑے کئی کئی منزلہ ہوٹل مکہ شریف اور مدینہ منورہ میں بھی دیکھے۔دبئی کی اونچی اونچی عمارتیں اور نیویارک کی عمارتیں۔۔غرض دنیا میں جیسے انھیں بنانے کی اک دوڑ سی لگی ہے۔لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں ہمیں یہ ہائی بلڈنگز کینیڈا میں ہی زیادہ محسوس ہورہی تھیں۔مانٹریال کی تصاویر دیکھیں تو ان میں بھی یہی اپنی شان کے ساتھ کھڑی تھیں۔بلکہ کینیڈا کے اکثر صوبوں اور شہروں میں یہی ہائی بلڈنگز نمایاں ہیں۔ٹورنٹو ہو یا مانٹریال،وین کوور ہو یا کیوبک،کال گیری ہو یا کوئی اور شہر،اس خاصیت کو ہم کینیڈا کے ہی نام کرتے ہیں۔حالانکہ جیسے ہی ٹورنٹو سے باہر نکلتے ہیں اور اس کے نواحی علاقوں میں جاتے ہیں یا اردگرد کے باقی شہروں سے گزرہوتا ہے تو منظر ایک دم بدل جاتا ہے۔لگتا ہے کسی خاص وادی سے باہر آ گئے ہیں۔ذرا دور نکل کر ماحول کچھ لائیٹ سا محسوس ہونے لگتا ہے۔بڑی بڑی عمارتیں، فلیٹس نظروں سے اوجھل ہوجاتے ہیں۔کینوس پہ کچھ ہلکے پھلکے رنگ آ جاتے ہیں۔اور ٹاؤن نما ایریے اور صنعتی علاقے نظر آنے لگتے ہیں۔۔

کینیڈا میں تقریباً اڑھائی،پونے تین ماہ کا ٹور رہا اور بہت اچھا وقت گزرا۔ٹورنٹو اور اس کے اردگرد شہروں تک ہی قیام رہا۔ٹورنٹو کے علاوہ برلنگٹن،اوسوا،بریمٹن اور نیاگرا شہر تک جانا ہوا۔چاہتے ہوئے بھی کیمرج نہ جاپائے اور مانٹریال کے لیے بھی دعوت نامہ ملا تھا۔کہ سکھوں کی ثقافت اور ان کا کاروبار زندگی بھی ہمیں قریب سے دکھایا جاتا۔وہ بھی رہ گیا۔جبکہ ٹورنٹو میں سکھ اتنے نظر ہی نہیں آئے۔اکادکا ہی سکھ فیملی نظر آئیں اور سکھوں کو وافر نہ دیکھ سکنے کی تشنگی ہمارے دل میں باقی رہ گئی۔ البتہ ہمارے اس ٹور کا فوکس۔۔چینی۔۔رہے،سو اب ان کے قصے جرمن میں ہماری زبان زد ہونے والے تھے۔بھئی ہمیں تو ان سے مل کر بہت اچھا لگا۔چینی پاکستانی بھائی بھائی۔۔البتہ جن احباب سے ملاقات نہ ہوسکی۔ان کا

گلہ اپنی جگہ برقرار رہے گا۔ انشاء اللہ، اگلے ٹور میں یہ شکوہ شکایت دور کرنے کی کوشش ہو گی۔ دراصل ایسی سیاحت کے لیے روشن کھلے کھلے لمبے دنوں کا ہونا زیادہ بہتر ہے۔ اور ہمارے اس ٹور میں دن چھوٹے اور راتیں لمبی تھیں۔۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم نے کینیڈا کی فضاؤں میں خوب پر لطف وقت گزارا۔ ہر دن اک نیا رونق والا دن بن کر طلوع ہوتا۔ اک نیا پروگرام، نیا شیڈول ہوتا۔ کبھی ملنا ملانا ہوتا تو کبھی شاپنگ، کبھی کوئی ملنے آجاتا، کبھی ہم کسی سے ملاقات کرنے پہنچ جاتے۔ اور سچ جانیں تو اس طویل پروگرام میں ہم وہاں کے ماحول میں خوب رچ بس گئے تھے۔ لائبریری بھی اپنی ہی لگتی اور چینی بھی اپنے اپنے سے۔۔ چینیوں کو زیادہ تعداد میں دیکھ کر اور آئے دن چائنیز کھانے کھا کر ہمارا ان سے خوب بھائی چارہ بھی ہو چکا تھا۔ ہندی انڈین عورتوں کی بندیا اور مانگ میں لال سیندور بھی غور سے دیکھ چکے تھے۔ البتہ سری لنکا لوگ خواہ وہ عورتیں ہوتیں یا مرد، ان کے ماتھے پر سفید رنگ سے کھنچی خط متوازی کی طرح چار لکیریں ہمیں اچنبھے میں ڈال دیتیں اور ہم ان سے اسے لگانے کی وجہ پوچھتے پوچھتے رہ جاتے۔۔

کینیڈا کے ملٹی نیشنل لوگ آئے دن سفر بھی خوب کرتے ہیں۔ اور کینیڈا کی ہواؤں نے بھی اپنا رنگ ہمیں خوب روشناس کرایا۔ طوفانی رات میں کھڑکیاں بند ہونے کے باوجود ہوائیں جس طرح ان پر اپنا سر پٹختیں، لگتا ان پر کوئی وحشت طاری ہے۔ رات کے وقت خوبصورت روشنیاں ہمیں پہلے ہی اپنا اسیر کر لیتیں۔ اوپر سے اتنے جہاز گزرتے۔ کبھی کھڑکی کے پاس کھڑی ہو جاتی تو دیکھتی ہر تین منٹ بعد کسی نہ کسی طرف سے جہاز نظر آجاتا۔ یہ بات ہم نے فرینکفرٹ ائر پورٹ کے لیے پڑھی اور دیکھی تھی کہ وہاں ہر تین منٹ بعد ایک جہاز لینڈ ہوتا ہے۔ اور یہ تال یہاں بھی آکر مل گئی تھی۔ جہاز کافی نیچی پرواز میں نظر آتے۔ جبکہ ائر پورٹ پون گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔ اور بیک وقت کئی کئی جہاز نظر آتے۔ سفر وہاں

کے لوگوں کی زندگی میں معمول کی طرح شامل ہے۔ اکثر سنتے۔۔ کہیں کوئی آؤٹ لینڈ جارہا ہے، کوئی آ رہا ہے۔۔ یورپ کی طرح یہاں بھی تازہ دم ہونے کے لیے چھٹیاں منانے جاتے ہیں۔ اور اسی چکر میں کینیڈا کے لوگ امریکہ کی کسی ریاست کی طرف نکل جاتے ہیں اور امریکہ والے کینیڈا میں آ جاتے ہیں۔ ویسے پڑوس میں تو آنا جانا ہی چاہیے اور ایسے میں کافی لوگ یورپ کی طرف بھی نکل جاتے ہیں۔ خصوصا انگلینڈ، پیرس، ڈنمارک، ناروے، ہالینڈ کی جانب۔۔ جرمنی کی طرف لوگ ذرا کم ہی آتے ہیں۔۔

پاکستان کی طرف سے بھی اور کینیڈا کی طرف سے بھی۔۔ حیران کن بات تب لگتی ہے، جب لوگ پاکستان سے انگلینڈ پہنچ جاتے ہیں اور انگلینڈ سے انھیں جرمنی کا ویزا نہیں ملتا۔ سو کہا جا سکتا ہے کہ جرمنی کا امیگریشن زیادہ سخت ہے۔۔

کینیڈا اور امریکہ سے جو لوگ پاکستان جاتے ہیں یا وہاں سے آتے ہیں۔ ان کے لیے سفر بہت لمبا ہو جاتا ہے سولہ گھنٹے کا سفر۔ اسی لیے اکثر لوگ اسی آنے جانے میں یورپ میں تھوڑے دن قیام کر کے پھر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس طرح سفر کی طوالت بھی کم لگتی ہے اور مسافر تازہ دم ہو کر باقی مسافت طے کر لیتا ہے۔ پاکستان سے اکثر لوگ گرین کارڈ کی کشش میں امریکہ جانے کے لیے تگ و دو کرتے ہیں۔ اپنی ساری توانائیاں وہاں پہنچنے کے لیے لگا دیتے ہیں۔ اور جیسے ہی امریکہ کے باسی بن جاتے ہیں۔ پھر وہاں سے کینیڈا جا کر رہائش اختیار کر لیتے ہیں۔ کیا مزے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ ہاں بھئی، جہاں کا دانہ پانی لکھا ہو، وہ وہیں کھینچ کر لے جاتا ہے۔ ٹورنٹو میں کچھ ایسے لوگ بھی دیکھے جو خود امریکہ میں جاب کرتے تھے اور فیملی کینیڈا میں رہائش پذیر۔ سو ان کا ایک پاؤں امریکہ اور دوسرا کینیڈا میں رہتا ہے۔ اکثر یہ سمجھوتہ بچوں کی ایجوکیشن کے لیے کیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ ایک جگہ ٹک کر پڑھائی کر

سکیں۔ ویسے وہاں ہم نے لوگوں میں امریکہ جا کر رہنے کا اتنا چارم نہیں دیکھا۔ بس امریکہ گھومنے پھرنے، چھٹیاں منانے اور وہاں کی پرکشش سیل آفرز کے لیے ٹھیک ہے۔۔

فوٹوشوٹ

چارسال پہلے جب کینیڈا گئے تھے تو اول تو دل کو یقین نہیں ہورہا تھا کہ ہر بار ہمارا لمبا سفر جو انگلینڈ اور پاکستان کی طرف طے ہوتا تھا۔اس بار کیسے اس نے اپنی ڈائریکشن بدل لی ہے۔بالکل ایک انجان دنیا اور اس دنیا کے لوگ ہمیں اپنی اور بلا رہے تھے۔ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی جزیرے پر جانے والے ہیں۔جس کے نہ تو موسم کا اندازہ ہے اور نہ ہی لوکیشن کا۔کہ کیا کپڑے لے کر جائیں اور کیا چھوڑ کر جائیں۔وہاں کیا کھانے کو ملے گا اور کس چیز کے لیے دل کو مارنا پڑے گا۔اوپر سے ہمیں نادان،انجان سمجھ کر پہلے کینیڈا کا چکر لگانے والے احباب ہمیں ضرورت سے زیادہ مشورے اور نصیحتیں کرر ہے تھے اور اپنے تجربے سے مستفید کروا رہے تھے۔ہم اندازہ کرر ہے تھے کہ اگر وہاں بھی زیادہ ایشیئن لوگ ہیں تو کچھ انگلینڈ جیسا ماحول ہوگا۔اور یو کے کا ماحول تو ہمارا جانا پہچانا ہے تو اس سے کیا گھبرانا۔؟لیکن احباب کینیڈا کے لائف سٹائل کو پاکستان سے جوڑر ہے تھے اور یہی بات ہمیں کنفیوژن دے رہی تھی۔خیر ہم ہر طرح کے حالات کے لیے تیار ہو گئے۔خیال تھا کہ اگر وہاں کی زندگی پاکستان سے مل رہی ہے تو یقیناً پاکستان جانے کی طرح ادھر بھی دوست احباب فرمائش کی اک لمبی لسٹ تھما دیں گے۔اور ہمیں وہ چیزیں بھی کھوج کھوج کر لانی ہوں گی۔سو ہم پہلے ہی تیار ہو گئے۔بھئی،اگر ہم خوش تھے تو ہمیں احباب کو بھی تو خوش کرنا تھا نا۔آخر اسی طرح خوشی بڑھنی تھی۔لیکن ہم حیرانی میں رہ گئے جب ایسی کوئی بھی فرمائش نہ ہوئی۔بلکہ سب نے ایک ہی وش کی۔اور وہ بھی اس تاکید کے ساتھ کہ ہم کینیڈا میں اپنے ٹرپ کے ڈھیروں فوٹو بنا کر لائیں۔اور یہی ان کے لیے خاص وہاں کا تحفہ ہوگا۔اور ہم ویسے تو بڑے پر مسرت تھے لیکن ابھی اس فوٹو شوٹ بارے ہم نے اتنا سوچا ہی نہ تھا۔خیال تو یہی تھا کہ وہاں خوب گھوم پھر کر

اپنا آپ واپس لے آئیں گے۔ اور احباب کو وہاں کے قصے سنا کر سفر اور ٹرپ کی یادیں دوبالا کر لیں گے۔ کیونکہ ہمارے لیے صرف منزل ہی نہیں سنگ میل، پڑاؤ اور لوگ بھی بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اور ان سے بھی کوئی نہ کوئی یاد وابستہ رہ جاتی ہے۔ لیکن اب دوست احباب نے خود ہی ایسی فرمائش کر دی تھی جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے ان کی خاطر خوب تصاویر بنائیں۔ پھر کینیڈا میں فطرت کے نظارے بھی بہت خوب تھے۔ جھیلوں کا ملک کینیڈا، جس میں جا بجا جھیلیں موجود تھیں، جن کے نام پر شہروں کے نام بھی رکھے گئے تھے۔ نیاگرا فال جیسی ساحرہ، کسی اور طرف بھی نکل جاؤ تو اس کائنات کا اک نیا منظر منتظر ہوتا اور اکثر ایسے سین مل جاتے۔ جنہیں کیمرے میں مقید کیے بغیر آگے بڑھنا مشکل ہو جاتا۔ فطرت کے بعد جگمگاتے شاپنگ پلازا بھی ہمیں اپنی اور بلاتے۔ مزے کی بات یہ رہی کہ آوٹ ڈور ہمارا کیمرا لوگوں کو نظر انداز کر کے نیچر کو ہی توجہ دیتا اور ان ڈور عزیز احباب کے ساتھ یا خود کی فوٹو کے پیچھے پلازا نظر آتا۔ تب بھی ڈھیروں فوٹو شوٹ کر کے آئے تھے اور واپس آ کر ان کی سی ڈی بنا کر محفوظ کر لی تھی۔ اور دوست احباب ٹی وی پر ہمارے کینیڈا ٹرپ کی تصاویر دیکھ لیتے اور داد دے لیتے۔

اس بار تو ماحول جانا پہچانا تھا اور ایک ٹور کا تجربہ بھی پاس تھا۔ اس لیے بے تحاشا کی بجائے ذرا سوچ سمجھ کر فوٹو شوٹ کی۔ فطرت کے نظارے اس بار بھی زبردست رہے۔ خزاں کی بدولت خالی ہوتے شجر ہمیں تکلیف تو دے رہے تھے لیکن ہم نے ان کا خالی پن بھی اپنے کیمرے میں محفوظ کیا۔ کرسمس اور نئے سال کی رونقیں خوبصورت روشنیاں اور نیاگرا میں میلے کا سماں بڑے بڑے جھولے، اونچے اونچے ٹاور، نیاگرا فال پر پڑتی روشنیاں اور سامنے امریکہ کی روشنیوں سے سجی عمارتیں، ایک سے بڑھ کر ایک سین ہمارے کیمرے کی زد میں آتا رہا اور ہم اس سے فائدہ اٹھاتے رہے، فوٹو بناتے رہے۔۔۔

☆☆☆

سردی اور گرم کپڑے

روانگی سے پہلے جرمنی میں اکثر دوست احباب کینیڈا کی شدید سردی کا ضرور ذکر کرتے تھے اور ہمارے نالج میں اضافہ بھی کرتے تھے۔ جو اس شدت کو خود دیکھ چکے تھے۔ ان کا زور بیاں تو ہمیں ہولائے ہی دے رہا تھا۔ اور پھر اپنی آنکھوں سے کڑاکے کی گرمی دیکھنے کے بعد سردی بھی کچھ اسی کی ہمجولی لگتی تھی۔ اس لیے ہم بھی وہاں جا کر سردی سے سکڑنا نہیں چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں کینیڈا سے ہمیں میزبان بھی برابر بتا رہے تھے کہ سردی بہت ہو گی، درجہ حرارت دن میں بھی منفی ڈگری ہوتا ہے۔ بلکہ ایک بار دن میں منفی پچیس ڈگری میں میزبان حضرت گھر سے قریبی شاپنگ مال پیدل واک کرتے چلے گئے تو ان کے سر کے بال لوہے کی طرح اکڑ گئے تھے۔ ایسی بپتا سنا کر وہ ہمیں ایک طرح سے اس سردی کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر رہے تھے۔ اور برابر تاکید ہو رہی تھی کہ گرم کپڑوں کی بہت ضرورت رہے گی۔ اچھا ہوا مہربانوں نے بروقت بتا دیا۔ اور ہم جو اس ان دیکھی سردی سے پہلے ہی مرعوب اور مغلوب ہو چکے کچھ اور احتیاط کے ہاتھوں مجبور گرم کپڑوں کا ڈھیر اپنے سامنے پھیلا لیا تھا۔ ہم ان لوگوں میں نہیں آتے، جو یہ سوچتے کہ خیر ہی ہے، تب کی تب دیکھی جائے گی۔ اور پھر بے تکلفی سے میزبان کی جرسی پہنے ہوتے، شال اوڑھے ہوتے اور اس کے شوز پہن کر اسی کے گھر میں دندناتے پھرتے۔ بھئی، پھر ہماری اپنی پہچان تو کسی کونے کھدرے میں چلی جانی تھی اور یہ ہمیں منظور نہ تھا۔ سو یہ بھی رکھ لیں، یہ بھی بہتر ہو گا۔ اور یہ بھی اور ہاں وہ بھی۔۔ کیا پتہ۔۔ کیا پتہ۔۔ کرتے کرتے بہت سے گرم کپڑے پیک کر لیے اور مطلوبہ وزن کب کا پورا ہو چکا تھا۔ رہ رہ کر جہاز والوں پر تاؤ آ رہا تھا کہ اتنا کم وزن لے جانے کی اجازت کیوں ہے۔؟ اب بندہ سردی میں سفر کرے گا تو گرم کپڑے تو لازم ہیں نا اور ان کا

بھاری بھرکم ہونا بھی عام بات ہے۔ سو مطلوبہ وزن سے بھی زیادہ ایک بیگ تیار کر کے جہاز والوں کے ہاتھ میں تھما دیا تھا کہ بس اب تم ہی جانو۔۔۔

اور جس سردی کے ڈراوے ہمیں دیئے جا رہے تھے، وہ کینیڈا اس سال پڑی ہی نہیں۔ بس دو تین بار ہی سنو پڑی۔ کرسمس سفید ہوئی، نیو ائیر اور ہماری واپسی کے قریب تھوڑی پڑی اور معاملہ ختم۔۔ اور وہ گرم کپڑے، نرم نرم اونی شال، فر کی ٹوپی والا کوٹ اور گھٹنوں تک لانگ شوز، سب ویسے ہی کینیڈا کی سیر کر آئے۔ ناصح خود شرمندہ تھے اور اپنی خفت مٹانے کے لیے وہاں کے معتدل، بہتر موسم کو ہمارے مبارک قدموں سے جوڑ رہے تھے۔ اور ہم کھلے دل سے یہ ایوارڈ لے رہے تھے۔ اور کبھی وہ مذاقاً کہہ دیتے کہ آپ کینیڈا کی سردی سے بچ کر جا رہے ہو۔ تو اسے ہم اپنی خوش قسمتی تعبیر کر لیتے۔ اب یہ علیحدہ بات ہے کہ جس سردی کے اتنے ڈھنڈورے پڑ رہے تھے۔ وہ کسی اور جگہ گھات لگائے بیٹھی تھی اور شدت سے ہمارا انتظار کر رہی تھی۔۔

اچھی میزبانی

ویسے تو ہم بھی بڑے اچھے مہمان ثابت ہوتے ہیں کہ ہمارے ہوتے ہوئے بھی میزبان کو یہی فکر پڑی رہتی ہے کہ۔۔آج کیا پکائیں؟۔۔ہم ان بے تکلف مہمانوں کی طرح نہیں جو پٹ سے کہہ دیں کہ بھئی آج مرغ روسٹ ہو جائے۔۔چائنیز ہو جائے،کوئی نہاری کا دیدار کرا دیں یا پٹنہ کی بریانی ہو جائے یا منہ کا ذائقہ بدلنے کو سیخ کباب ہی کھلا دیں۔۔۔بلکہ ہمارا بس چلے تو آج کی مہنگائی کے دور میں میزبان کو سبزی،دال پہ لگا کے آتے۔۔بہر حال،

اچھی میزبانی نبھاتے ہوئے مہربان میزبانوں نے میرے نہ نہ کرتے بھی میری کم چائے پینے کی عادت کو سنی ان سنی کرتے۔۔ٹم ہارٹن۔۔کی فرنچ ونیلا کافی بہت پلوائی۔اور رواداری میں ہم بھی پیتے رہے۔کیونکہ یہ کافی نہ تو ہمیں انگلینڈ میں ملنا تھی نہ جرمنی اور نہ ہی کہیں اور۔۔اس لیے میزبان اسے بصد اصرار پلانے پر بضدر ہتے۔اور ہم مروت میں مارے جاتے۔گرم گرم کافی پینے میں بہت مزیدار تھی۔ونیلا کا ذائقہ تھا۔اس کی شکل پر بھی ہمیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ہم تو بس اس کی تاثیر سے گھبرا رہے تھے۔جتنے اس کے چرچے تھے اتنے ہی جگہ جگہ یہ کافی ہاؤس مل جاتے تھے۔واپسی سے پہلے ایک بار پھر دعوتوں کا عروج تھا۔عزیز اقرباء کی دعوتیں الگ ہرو یک چل رہی تھیں اور میزبان بھی ایک بار پھر ایکٹو تھے۔اچانک ہی جھٹ پٹ باہر کھانے کا پروگرام بنا لیتے۔اور پوچھتے،

؛چائنیز کھانا چلے گا یا دیسی؟:

اور ہم دعوتیں کھا کھا کر کافی سیر ہو چکے تھے۔اب نہ تو نہ کرتے بنتی اور نہ ہی ہاں۔۔سو کوئی جلیبی جیسا جواب ہم انھیں دے دیتے اور دل میں مسکاتے کہ اب اصل مدعا اس میں سے وہ خود ہی ڈھونڈتے

رہیں۔۔پھر دل میں سوچتے کہ دعوتیں تو غالباً ہمارے جانے تک چلتی ہی رہیں گی۔۔ائر پورٹ پر ہمارا چیک ان کروا کر ہی یہ سب اپنے نارمل کھانے پینے کی روٹین پر آئیں گے۔پچھلے کینیڈا کے چکر میں ان احباب نے ہمیں اتنا چکن کھلا دیا تھا۔چکن کڑاہی ،چکن بریانی ،چکن تکے،بٹر چکن،چکن قیمہ کباب، چکن سیخ کباب ،چکن شاشلک ،چلی چکن،روسٹ چکن،چکن لیگز ،چکن پکوڑے،چکن ہرا مصالحہ،چکن اسٹکس ،چکن کوفتے ،چکن بوٹی کباب،تندوری مرغی ،سالم چکن،چکن قورمہ،بروسٹ چکن،اچار چکن، چکن جلفریزی ،چکن نہاری ،تلی ہوئی مرغی،چکن نگٹس ،چیز چکن سینڈوچ ،چکن رول ،چکن اسپیشل ،چکن کھچڑی ،مرغ مسلم،چکن پزا،مرغ حلیم ،چکن بریسٹ ،دہی والی مرغی۔۔اف چکن چکن چکن، کہ ہمیں خواب میں بھی چکن ہی نظر آنے لگا تھا اور ہم بے اختیار کہنے لگے تھے کہ، ہائے ہائے بے چارا چکن۔۔ اور جرمنی واپس پہنچ کر ہم نے ڈیڑھ سال چکن نہیں کھایا تھا۔دل ایسا بھر پایا تھا کہ کیا بتائیں۔۔اور فون پر بھی اس بابت بات کر کے ہم اور میزبان قہقہے لگانے لگتے تھے۔سو موجودہ چکر میں جاتے ہی ہم نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ بھئی اس بار ہماری مروت کو آزمایا نہ جائے۔ہم نے بڑی مشکل سے دوبارہ چکن سے دوستی کی ہے۔اس بار ہتھ ذرا ہولا رکھا جائے۔ورنہ احتجاجاً ہم دعوت شیراز پر آ جائیں گے۔پھر کچھ مت کہیے گا۔لگتا ہے یہ بات انھیں سمجھ آ گئی۔اور ہمارے بہانے میزبان کو بھی دعوتیں کھانے اور تگڑا کھانے کی عادت ہو گئی تھی۔۔

ویسے ہمیں بڑی فکر تھی کہ پونے تین ماہ دعوتیں کھا کھا کر،ہوٹلنگ کر کر کے اور بغیر کسی فقر و فاقہ کے اتنا وقت گزارنے کے بعد یقیناً ہم کینیڈا سے کچھ صحتمند ہو کر جائیں گے اور جرمن کے احباب کو ہمارا اچھا کھایا پیا بھی نظر آئے گا۔اور وہ دھیرے سے مسکرائیں گے بلکہ ان کے دلوں میں تو پھلجھڑیاں چھوٹیں گی ،آخر

اتناتو ہم بھی انھیں پہچانتے ہیں۔ کہ وہ دل ہی دل میں خوش ہوں گے کہ اب ہمیں یہ اضافی وزن اتارنے کے لیے ایکسٹرا جتن کرنے پڑیں گے۔ اور وہ ہمیں یہی جتن کرتے دیکھنا چاہیں گے۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ رمضان میں جہاں کئی لوگوں کا وزن دو چار کلو کم ہو جاتا ہے۔ وہیں ہمارا وزن اگر رمضان میں بڑھتا نہیں تو کم بھی نہیں ہوتا۔ اور ایک ہی جگہ اڑیل ٹٹو کی طرح رک جاتا ہے۔ اور ادھر ہم تھے کہ ان کی ان خیام خیالیوں پر پانی پھیرنا چاہتے تھے۔ اور جیسے آئے تھے ویسے ہی چھم سے ان کے سامنے جہاز سے اترنا چاہتے تھے۔ اور اس کے لیے ظاہر سی بات ہے کہ ہمیں میزبانوں کے بھرپور ساتھ کی ضرورت تھی کہ وہ کھانے کھلانے میں اعتدال سے کام لیں۔ ورنہ ہمارے ساتھ ساتھ انھیں بھی یہ تنگی ہو سکتی تھی۔ کہ ہمارے جانے کے بعد وہ بھی ڈائٹ پر آ جاتے۔ اور ہم تو جرمنی جا کر اس پر جاتے ہی جاتے۔ سو در پردہ ایک دوسرے کو کوسنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر پہلے ہی سمجھداری سے کام لیا جاتا۔۔

اسی لیے صاف گوئی سے انھیں کہہ دیا کہ،

:اگر اس بار بھی انھوں نے ہمارے ساتھ پہلے والا کھیل کھیلنے کی کوشش کی اور ہمیں۔۔ چکن چکن۔ کھلانے کی کوشش کی تو پھر ہم بھی انھیں۔۔ دالیں دالیں۔۔ کھلا کر جائیں گے۔ اور ہماری فرمائش پر انھیں یہ ہر صورت پکانی اور کھانی پڑیں گی۔ ملکہ مسور، دال چنا، دال کا سوپ، بیسن کی کڑھی، چنے کی دال کا حلوہ، دال مکھنی، ثابت مسور، بیسن کی روٹی، مونگ اور مسور دال کا سوپ، کھچڑ چھولے، چنا چاٹ، فروٹ چنا چاٹ، چنے کی دال کے پکوڑے، مونگ دال کی کھچڑی، ارہر کی دال، ماش کی بھنی دال، مونگ دال، مکس دالیں، ثابت ماش کی چھلکوں والی دال، لوبیا، کھٹی دال وغیرہ وغیرہ۔:

لیکن میزبان سمجھدار نکلے۔ اور پورے ٹور میں دال صرف دو یا تین بار بنی۔ مرغی بھی اعتدال سے کھلائی

گئی۔اوراس بار مٹن، قیمہ بھی اتنا ہی چکن کے مقابلے پر رہا۔اوراقبال فوڈ زندہ باد، جہاں سے یہ ساری ساری گروسری کی جاتی تھی۔پچھلی بار میز بانوں نے کیک بہت زیادہ کھلائے تھے۔اسٹرابری کیک، چیز کیک، چاکلیٹ کیک، ڈرائی فروٹ کیک، انڈوں کا کیک، کیرٹ کیک، کوفی کیک، آلمنڈ کیک، چیری چیز کیک اور کیک ہی کیک۔۔اور جدھر بھی دعوت پہ جاؤ کیک ہی لے کر جاؤ اور پھر میٹھے میں بھی کیک ہی وہاں ملے۔سو ہم نے لگی لپٹی رکھے بغیر انہیں کہہ دیا تھا کہ،

:اس بار زیادہ کیک کیک مت کیجئے گا۔

کیک بھلا کبھی کھیر، زردے کی جگہ لے سکتا ہے کبھی نہیں۔۔

کیک کبھی مٹھائی کی جگہ لے سکتا ہے ہرگز نہیں۔۔

لڈو، برفی، چم چم، گلاب جامن، بالوشاہی، کراچی سوہن حلوے، رس گلے، بیسن کی مٹھائی، روایتی میٹھے کھانے والوں پر ابھی اتنا برا وقت نہیں آیا کہ وہ ان کی جگہ کیک کو دے دیں۔:

سو سمجھنے والے سمجھدار ہمارا مدعا اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔اس لیے ہم نے مٹھائی لانے پر ان کو کبھی جھوٹے منہ بھی منع نہیں کیا۔بلکہ ٹورنٹو میں اقبال فوڈ کے علاوہ بھی جگہ جگہ کی مٹھائی ہم چکھ کر انھیں بتاتے اور نمبر دیتے رہے۔کہ کس جگہ کی مٹھائی نمبر ون ہے اور کہاں کی بس ایسے ہی۔۔عام۔۔سی ہے۔اور اس طرح ہم نے وہاں جا کر اپنے دل کو ترسایا نہیں ونک ونک۔بھئی اگر کچھ کھانا ہی ہے تو بندہ اپنی من پسند کھائے ۔۔نہ کہ صرف دنیاداری کو کھائے۔۔اور اب کیا بتائیں اپنی پسند پر تو بعض دفعہ ایک چائے کا کپ ہی کتنا سکون دے دیتا ہے۔اور جب رات کو ایک ہاتھ میں ایک گلاس گرم دودھ، منہ میں رس گھولتی مٹھائی اور دوسرے ہاتھ میں من پسند رائٹر کی کتاب ہوتی اور سامنے ٹورنٹو شہر کی روشنیاں تو اس دل کو اور کیا چاہیئے تھا۔اسی لیے وہاں بے شمار راتیں ہم نے اپنے دل اور اسکی دنیا پر لٹا دیں۔۔۔

واپسی کی پیکنگ

عموماً سفر پر جانے والی پیکنگ کا زور و شور سے اہتمام کیا جاتا ہے۔ سفر ناموں میں بھی اکثر یہی دیکھا ہے کہ جاتے ہوئے تمام سفر کی تفصیل بیان کی جاتی ہے اور واپسی پر ایک فقرے میں بات تمام کر دی جاتی ہے۔ جیسے واپسی کا ارادہ کرتے ہی پہلا قدم دھرتے ہی مسافر گھر پہنچ گیا ہو۔ مانا جانے کی کہانی کچھ ایسے ہی ہوتی ہے، جیسے بچے ہنستے، کھلکھلاتے ہوئے ننھیال جاتے ہیں اور واپسی پر منہ لٹکائے آتے ہیں۔ بالکل ایسا ہی ایک مسافر کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ کہ سفر پر جانے کا جتنا جوش ولولہ ہوتا ہے۔ واپسی کا سفر اتنا ہی تھکن اور بوجھل قدموں سے طے ہوتا ہے۔۔ دل میں کہیں نہ کہیں اک اداسی سی ابھرنے لگتی ہے۔ منزل جیسے دامن تھامنے لگتی ہے کہ میرے پاس آ کر اب کدھر جا رہے ہو۔۔ کہاں جا رہا ہے تو اے جانے والے؟

ہمارا حال بھی ان مہربانوں سے کچھ مختلف تو نہیں۔ جاتے ہوئے دل بے اختیار گنگناتا ہے،

بادل جھوم کے چل دھرتی کو چوم کے چل

موسم مہکا مہکا ہے دل بہکا بہکا جائے

اور واپسی پر دل کی کیفیت اور ہوتی ہے۔۔ لگنے لگتا ہے کہ جس منزل تک اتنی تگ و دو کے بعد پہنچے تھے وہ پھر چھوٹی چلی جاتی ہے۔۔ اور شدت سے احساس ہونے لگتا ہے، جیسے منزل پیچھے سے صدا دے رہی ہو،

چل اکیلا چل اکیلا چل اکیلا

تیرا میلہ پیچھے چھوٹا راہی چل اکیلا

اسی لیے واپسی کے سفر کی اہمیت بھی ہمارے لیے اپنی جگہ باقی ہے۔بھئی اس کے لیے بھی ہمیں جہاز میں بیٹھنا ہوگا۔اس کی بھی اچھی خاصی پےمنٹ کر چکے ہیں ۔اتنا ہی وقت بھی تو دینا ہوگا۔۔

یہ علیحدہ بات ہے کہ سکون کا سانس تبھی آتا ہے، جب تک واپس آ کر اپنے تکیے پر سر نہ ڈال دیں اور اپنے لحاف کو بازؤں میں دبوچ نہ لیں ۔۔

سفر پر جانے کی مطلوب شاپنگ ہم بڑے آرام سے کر لیتے ہیں ۔اور سوٹ کیس کی پیکنگ کرنا کونسا مشکل کام ہے۔۔تحائف لانا ان کو سوٹ کیس میں جمانا یہ خوش کن احساس دلاتا ہے کہ اب سفر شروع ہونے والا ہےاور روٹین کی زندگی سے کچھ ہٹ کر ہونے والا ہے۔ پہلے گھر بیٹھے ٹی وی ،انٹرنیٹ کے ذریعے دنیا دیکھتے ہیں ۔اب باہر نکل کر لائیو دیکھنے کا موقع ملے گا۔ ہماری طرح کے اور ڈھیروں مسافر کسی نہ کسی جگہ پر ہمارا انتظار کریں گے اور ہم ان کے ہم سفر اور ہم قدم بنیں گے۔اور ان میں ایسے کئی مسافر بعد میں یاد بھی آتے رہیں گے۔۔

جاتے ہوئے ہمیں جس طرح رات کے گل ہونے کی فکر رہتی ہے اور بروقت ائر پورٹ پہنچنے کی فکر ہو جاتی ہے۔ذہن میں کہیں نہ کہیں یہ خیال موجود ہوتا ہے کہ یا اللہ ،سفر امن وامان سے ہو۔ہم سفر مسافر اچھے ملیں ۔جہاز کی سروس اچھی ہو۔اور آگے میزبان ضرور موجود ہوں ورنہ ہمارا استقبال کون کرے گا۔۔؟

تو واپسی پر بھی آنے سے چند دن پہلے کچھ اور ہی احساس ہونے لگتا ہے۔جب میزبان باتوں باتوں میں ہمارے جانے کے بعد کی اداسی کا ذکر کرنے لگتے ہیں یا پوچھنے لگتے ہیں ،

:اب آپ کا اگلا چکر کب کینیڈا کا لگے گا۔وقت تو بہت جلد گزر گیا۔اتنی رونق تھی ہم تو اداس ہو جائیں

گے۔؟:

تب ہم بے اختیار مسکانے لگتے ہیں اور بے نیازی سے کہتے ہیں۔

:اتنی جلدی،ہمیں لگتا ہے وقت میں بڑی برکت رہی ہے۔سارے کام تو کر لیے۔رہی اداسی تو ہم دو چار سال بعد انشاءاللہ،پھر آپ سب کو اداس کرنے آ جائیں گے۔اور وہ ساحرہ نیاگرا فال بھی تو ہمیں اپنی اور کھینچے گی نا۔اتنے وقت کے بعد تو ہمارا کسی نہ کسی طرف چکر لگتا ہی ہے۔کبھی انگلینڈ،کبھی پاکستان،کبھی دنیا کے کسی اور گوشے کی جانب۔پر یاد رکھیے گا بھولیے گا مت کہ۔۔نو زیادہ چکن۔۔۔:

اس پر وہ مسکرانے لگتے۔اور کہتے،

:فکر مت کیجیے،آپ بس آیئے گا ضرور۔۔ابھی تو کینیڈا کی بہت سی جگہیں آپ کو دکھانا باقی ہیں۔:

:ویسے اب باری تو آپ کی بنتی ہے جرمنی آنے کی۔۔:ہماری طرف سے انھیں دعوت دی جاتی۔

:ہم بھی انشاءاللہ چکر لگائیں گے۔پچھلی بار جرمنی آئے تھے تو انگلینڈ بھی ہو آئے تھے۔اب کی بار جرمنی آئے تو فرانس بھی جائیں گے۔پیرس دیکھنے کو بڑا دل کرتا ہے۔کینیڈا سے جو بھی احباب یورپ جاتے ہیں وہ۔۔ایفل ٹاور۔۔ضرور دیکھ کر آتے ہیں۔ان کو دیکھ کر ہمارا بھی اشتیاق بڑھ جاتا ہے۔:

:ضرور ضرور،دل جب کبھی کبھار ضد کرے تو اس کی مان بھی لینی چاہیئے۔:ہم شرارت سے کہتے۔

کینیڈا رقبے کے لحاظ سے دنیا کا ایک دوسرا بڑا ملک ہے۔اس لیے کینیڈا میں رہنے والوں کو یورپ خاصا چھوٹا محسوس ہوتا ہے۔ایک محفل میں اس پر بات کرتے ہوئے ایک مہربان نے اپنے ہاتھوں کی ایک دو بالشت سے یورپ کا نقشہ واضح کیا۔جس پر ہمارے دل میں ایک پھلجڑی چھوٹی۔اس پر ہم نے انھیں یورپ گھومنے اور پھر اپنے ہاتھوں کے نقشے پر نظر ثانی کرنے کے لیے کہا۔۔۔

واپسی کے دن جوں جوں قریب آ رہے تھے۔ سفر کا احساس شروع ہو گیا تھا۔ سو سامان سمیٹ کر ایک جگہ رکھنے لگے۔ ورنہ ہم بھی اس گھر میں بکھرے سے گئے تھے۔ علیحدہ آرام دہ کمرا ہونے کے باوجود ہماری چیزیں کمرے سے باہر نظر آ رہی تھیں۔ نہ جانے کیسے۔۔ یہ ہماری سمجھ سے بھی باہر ہے۔ اور کچھ باتھ روم کے بڑے سے آئینے کے آگے پڑی تھیں۔ شاپنگ کا سامان اور ملے تحفے تحائف علیحدہ گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ اور ہم دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ یا اللہ، یہ سامان کیسے اتنا جمع ہو گیا۔ ہم نے تو ڈالر بھی سینت کر ہی خرچے۔ شاپنگ بھی پچھلی بار زیادہ کی تھی۔ اور ویسے بھی کافی چیزیں ہمیں جرمن میں بآسانی دستیاب ہیں تو یہاں سے انھیں کیا اٹھا کر لے جانا۔ پہلے ہم انگلینڈ جاتے تو واپسی پر کافی مصالحے کے پیکٹ لے آتے۔ لیکن ایک بار ٹی وی پر ایک حکیم کا پروگرام دیکھ لیا۔ ان سے پوچھا گیا کہ،

:کیسی غذا کھانی چاہیئے۔؟:

حکیم صاحب نے جواب دیا۔

: تازہ اور سادا غذا۔:

: سادا غذا آپکے نزدیک کیا ہے۔؟:

:وہ جو تازہ پکائی جائے اور جس میں زیادہ گھی اور مصالحے ڈالنے سے احتیاط کی جائے۔:

اور تب سے ہم نے غذا میں مصالحوں کا استعمال کافی کم کر دیا۔ اور جو مصالحے کچھ کھانوں کے لیے ضروری ہیں، انھیں گھر پر بنا لیتے۔ اور یہاں مصالحے انگلینڈ سے بھی سستے مل رہے تھے۔ لیکن ہم نے پھر بھی خریدنا ضروری نہیں سمجھا۔ سو اب اضافی سامان دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ اور الجھ رہے تھے کہ ابھی انھیں پیک بھی کرنا ہے۔ پہلے ہی آتے ہوئے گرم کپڑوں کا ایک ایکسٹرا پیک واپس جا رہا تھا۔ اوپر

سے شاپنگ اور تحائف کا خوشگوار بوجھ بھی جہاز کی پشت پر لادنا تھا۔ اور ایک اچھی خاصی تیاری کا مرحلہ ابھی باقی تھا۔۔

میزبان خاتون مسکراتی نظروں سے یہ سارا ہنگامہ دیکھ رہی تھی اور کئی بار دعوت بھئی دے چکی تھی کہ پیکنگ میں وہ ہماری مدد کر سکتی ہیں۔ لیکن ہم اپنا بوجھا خود ہی اٹھانا چاہتے تھے۔ سو مسکراتے ہوئے جوابا شکریہ کہتے اور دل میں خود سے پوچھتے کہ یہ سمیٹا سمیٹی کیسے ہوگی؟ پھر رات کو جب اپنے کمرے میں آتے تو تھوڑی بہت چیزیں سمیٹ کر سوٹ کیس میں ڈال لیتے۔ ہم ان لوگوں میں نہیں آتے جو آخری منٹوں میں بھاگ دوڑ کر رہے ہوتے ہیں۔ خود بھی ہاتھ پیر پھلائے پھرتے ہیں اور باقیوں کو بھی ہولائے دیتے ہیں۔ اور سفر سے کچھ روز پہلے پیکنگ کرنے کا ایک فائدہ یہ رہتا ہے کہ جو چیزیں چھوٹ رہی ہوں، وہ بھی یاد آ جاتی ہیں۔ اور بندہ آخری لمحات تک پرسکون رہتا ہے۔ ویسے اس معاملے میں بھی لوگوں کا سگھڑاپہ دیکھا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگ اتنی اچھی اور اتنی جلدی پیکنگ کر لیتے ہیں کہ بے اختیار انھیں داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ اور کچھ لوگ پیکنگ کا پھیلاوہ اتنا پھیلا لیتے ہیں اور پھر ایک آدھ چیز بے دلی سے سوٹ کیس میں ڈال رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارا ماننا ہے کہ اگر ترتیب اور سلیقے سے سوٹ کیس میں چیزیں رکھی جائیں تو کافی سے زیادہ چیزیں اندر سما جاتی ہیں۔ اب یہ سوچ کر ہم کبھی کبھی من میں مسکاتے ہیں۔ کہ جب جرمنی آ کر پہلی بار پاکستان گئے۔ تو سوٹ کیس میں زیادہ جگہ بنانے کی کوشش میں تمام کپڑے جما جما کر استری کیے، تہہ لگائی اور انھیں سیٹ کر کے رکھا۔ خیال تھا کہ پاکستان جا کر بھی ہمیں یہ کپڑے اسی طرح استری شدہ حالت میں ملیں گے۔ تو کسی کو زحمت دینے کی بجائے ان میں سے ایک آدھ سوٹ ایسے ہی نکال کر ہاتھ لے کر پہن لیں گے۔ لیکن جب پاکستان جا کر امی، ابو کے گلے لگنے اور ملنے ملانے

کے بعد کپڑے نکالنے کے لیے سوٹ کیس کھولا تو ہم دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔ لگتا تھا جہاز والوں نے ہمارے سوٹ کیس میں خسرے نچا دیئے ہیں۔ سو اس کے بعد دوبارہ ایسی خوامخواہ کی محنت سے ہم باز آئے۔۔ جو دل کو جلائے ستائے رلائے۔۔

ویسے ہمارا یہ بھی ماننا ہے کہ سفر میں سامان جتنا کم ہوگا، مسافر اتنی ہی آسانی محسوس کرے گا۔ لیکن ایسے ہوتا نہیں ہے۔ دنیا میں کسی طرف بھی جاؤ۔ جاتے ہوئے سوٹ کیس میں عزیز اقرباء کے لیے تحفے تحائف ہوتے ہیں اور بندہ انھیں دے کر بھی فراغت نہیں پاتا۔ کیونکہ واپسی پر عزیزوں کے دیئے گفٹ سوٹ کیس میں جگہ گھیرے ہوتے ہیں۔ سو یہ سفر میں تحفے تحائف کا ایکسٹرا کھاتہ کھلا رہتا ہے۔ ان باتوں سے ہمیں انکار تو نہیں ہے، کیونکہ یہ باتیں ہمارے ریت رواج میں شامل ہیں۔ حالانکہ یہ ریت رواج کبھی کبھی بندے کو کافی مشکل میں ڈال دیتے ہیں۔ سو ان باتوں کو جانتے بوجھتے بھی یہ سلسلہ دراز ہی رہتا ہے۔ ہم نے آج تک صرف ایک ہی فیملی ایسی دیکھی ہے، جنھوں نے خود اپنے لیے یہ طریقہ وضع کیا ہے کہ نہ تحفہ لیں گے اور نہ ہی تحفہ دیں گے۔۔۔

خوش رہو اہل چمن

آہستہ آہستہ پیکنگ بھی سمٹ ہی گئی۔ اور وہ دن آ گیا جس دن ہماری فلائیٹ تھی۔ حیران کن بات یہ ہوئی کی جرمنی سے آتے ہوئے ہماری فلائیٹ صبح چھ بجے کی فلائٹ تھی اور اب ٹورنٹو سے شام ساڑھے چھ بجے ہماری فلائٹ کا وقت تھا۔ ایک رات پہلے سے ہی موسم خراب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جب دن شروع ہوا تو خاصا ٹمیالہ سا تھا۔ دوپہر کے بعد برفباری ہونے کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔ ٹورنٹو کے ایک مقامی ٹی وی پر چوبیس گھنٹے موسم کے بارے میں خبریں ہوتی تھیں۔ پھر موٹروے پر رش بھی ممکن تھا۔ اس لیے ان دونوں چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بروقت نکلے اور ائر پورٹ پہنچ گئے۔ ائر پورٹ پر حسب معمول گہما گہمی جاری تھی۔ جلد بورڈ نگ شروع ہو گئی۔ اور ہمارا خیال ہے سکون کا مکمل سانس تب ہی آتا ہے۔ جب سامان بکنگ کے مراحل سے گزر جائے۔ کیونکہ کئی بار گھر میں سامان کا کیا وزن ہمیشہ ائر پورٹ پر تھوڑا فرق ہی نکلتا ہے۔ اکثر دو تین کلو اوپر نیچے ہونے کا امکان رہتا ہے ہو اور اس وقت پتہ نہیں ہوتا کہ ان دو تین کلو اضافی وزن کے لیے آپ کو کیسے رویوں سے واسطہ پڑنے والا ہے۔ کئی بار یہ اضافی وزن نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور کئی بار اسی کے لیے مسافروں اور جہاز کے عملے میں میں بحث اور تو تکرار ہوتے بھی دیکھی ہے۔ سامان کی بکنگ ہو گئی تو شکر ادا کر کے کاونٹر سے پیچھے ہٹے۔ بورڈ نگ کارڈ بھی مل چکے تھے۔ سامان سیدھا جرمنی تک بک ہوا تھا البتہ ہمیں انھوں نے دو قسطوں میں بک کیا تھا۔ ہالینڈ کے شہر ایمسٹرڈم کے ائر پورٹ شی پول پر ایک بار پھر ہمارے قدم اترنے تھے۔ بتایا تھا نا کہ یہ ائر پورٹ ہمیشہ ہمارے رستے میں آ جاتا ہے۔ کئی بار ہمیں ایسے لگنے لگتا ہے، جیسے سفر پر جاتے مسافر کو

راستے میں روک کر اس کا حال پوچھ رہا ہو۔۔اور کہہ رہا ہو،

ترا کوئی ساتھ نہ دے تو ،تو خود سے پریت جوڑ لے

بچھونا دھرتی کو کر کے،ارے آکاش اوڑھ لے

یہاں پورا کھیل ابھی جیون کا تو نے کہاں ہے کھیلا

چل اکیلا چل اکیلا چل اکیلا تیرا میلہ پیچھے چھوٹا راہی

پیئرسن انٹرنیشنل ائرپورٹ پر خوب رونق کا سماں تھا۔ اور سوا گھنٹہ وقت بھی تھا۔ میزبان ایک بار پھر ائر پورٹ کے ریسٹورنٹ سے کافی ،چائے پلانے کے لیے بضد ہو رہے تھے۔ جو ہم نے لاسٹ منٹوں میں ان کی معصوم خواہش سمجھ کر پورا کر دی۔ پھر کچھ دیر ائرپورٹ کی بجی سجائی دوکانوں پر گھومتے پھرتے وقت گزرا۔ یہ دوکانیں ہر ائرپورٹ پر ہمیں ایسے ہی لگتی ہیں۔ جیسے جاتے جاتے بھی مسافر کی جیب ہلکی کروالینا چاہتی ہیں۔ ان دوکانوں پر ہم نے پھر دو چار اور گفٹ لے لیے۔ ایک کی رنگ ایسا لیا جس پر کینیڈا کا نام اور اس کی پہچان کھدی تھی۔ پچھلے کینیڈا ٹور میں بھی غیر ارادی طور پر ایسی کئی اشیاء خرید کر لے گئے تھے۔ جن کا سیاق و سباق ہمیں کینیڈا کی یاد دلاتا رہا۔ اس بار ہم نے خود اس بات کو ملحوظ رکھا اور جہاں بھی ایسی کوئی مطلب کی چیز نظر آتی تو فوراً لے لیتے۔ کئی جگہ کیلنڈر،ڈائریاں،نوٹ بکس، مگ وغیرہ بڑے پسند آئے جو کارآمد بھی تھے اور ان پر کینیڈا کی پہچان پتہ بھی اپنے ہونے کا احساس دلاتا۔۔ سو یہ وقت بھی جلد ہی گزر گیا اور وہ گھڑیاں چلی آئیں جب بچھڑنے کا وقت آجاتا ہے۔ اک تکلیف دہ مرحلہ جس سے بار ہا گزرنا پڑتا ہے۔ ملن۔۔۔جدائی ،جدائی۔۔۔ملن۔،سو میزبانوں کی میزبانی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور انھیں جرمنی آنے کی دعوت دے کر ہم نے جرمن واپسی کا پہلا قدم اٹھالیا۔۔۔

پھر ملیں گے

پھر ملو گے کبھی اس بات کا وعدہ کرلو

ہم سے اک اور ملاقات کا وعدہ کرلو

جہاز میں کھڑکی کے پاس جگہ ملی۔ ساڑھے چھ بجے جہاز نے اڑان بھرنی تھی اور کینیڈا کی سرزمین سے اوپر اٹھ جانا تھا۔ اور سفر کی دعا پڑھتے ہوئے ہم نے کینیڈا والے احباب کو دل ہی دل میں خدا حافظ کہہ دینا تھا۔ اب دوبارا کب آنا ہوگا۔؟ یا قسمت یا نصیب والی بات تھی۔ بے شک ہمارے اس ٹور کو میزبانوں، عزیز رشتے داروں اور دوست احباب نے بہت کامیاب، یادگار اور پر رونق بنا دیا تھا۔ اور اب ہم اپنے دامن میں کینیڈا کے دوسرے یادگار سفر کی یادیں سمیٹے جارہے تھے۔ جہاز نے آدھا گھنٹہ دیر ٹورنٹو ائیر پورٹ پر ہی لگا دی۔ اور سات بجے جہاز کے پہیے حرکت میں آئے۔۔ ہم نے اس سے پہلے بھی بہت بار جہازی سفر دنیا کے مختلف ملکوں اور شہروں کی طرف کیا ہے۔ اس لیے اب تو عادت سی ہوگئی ہے۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں یہ جہاز ہمیں ضرورت سے زیادہ بڑا لگ رہا تھا۔ ہمیں جگہ بھی بالکل درمیان میں ملی تھی۔ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہی ساتھ ہی جہاز کا فلائنگ ونگ شروع ہو جاتا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم جہاز کے پر سے چمٹے ہوئے ہوں۔ جہاز جیسے ہی بلند ہوا، نیچے ٹورنٹو کی روشنیاں واضح ہو گئیں۔ باہر رات ہو چکی تھی۔ سارے شہر کی روشنیوں کے الاؤ جل چکے تھے۔ اور نیچی نیچی پرواز پر یہ سب بہت نمایاں لگ رہا تھا۔ اف خدایا، اک بار پھر جاتے جاتے بھی اک کمال کا خوبصورت منظر ہم اپنی آنکھوں میں سمو کر لے جا رہے تھے۔۔ اتنے میں جہاز نے کافی لمبا یوٹرن سا لیا تو جہاز کا ہماری طرف والا حصہ کافی نیچے کو جھولتا ہوا جھکا چلا جا رہا تھا۔ اور ٹورنٹو شہر کی روشنیاں اور قریب ہوئی جا رہی تھیں۔۔

ہمارے آنے سے ایک ہفتہ پہلے ہی واپسی پر احباب پھر ملنے کے لیے آ رہے تھے اور ہمارے آنے کی خوشی کا اظہار کرنے کے ساتھ اب ہماری واپسی پر کچھ افسردہ، اداس ہو رہے تھے۔ اور ساتھ ہی جلد پھر کینیڈا چکر لگانے کے لیے کہہ رہے تھے۔ انھیں لگ رہا تھا کہ ہمارے اڑھائی پونے تین ماہ جھٹ پٹ ہی گزر گئے ہیں۔ اس بات پہ ہم مسکرانے لگتے۔ کچھ احباب نے تو یہ مشورہ بھی دے ڈالا کہ ہم چھوڑیں جرمن کو اور کینیڈا میں آ کر سکونت اختیار کر لیں۔ جہاں رشتے داروں کے درمیاں بھی رہیں گے اور نیا گرا فال بھی جایا کریں گے۔ اور لائبریری تو بنی ہی ہم جیسے قدر دانوں کے لیے ہے۔ اور جگہ جگہ ریسٹورنٹ، اپنے لوگ، اپنا کلچر سب کچھ یہاں ملے گا۔ اگر دیس سے پردیس ہوئے ہیں تو ذرا من پسند جگہ پر رہیں۔ ہم ان کی یہ پر خلوص باتیں بغور سنتے رہے اور ان کی ہمدردیوں پر عش عش کر اٹھتے۔۔

تقریبا دس پندرہ منٹ تک جہاز ٹورنٹو اور اسکے نواحی شہروں پر اڑتا رہا اور ہمیں نیچے روشنیاں نظر آتی رہیں اور جب بہت بلندی پر پہنچ گیا تو باہر کچھ بھی دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ تب ہم نے جہاز کے اندر کی دنیا کی جانب رجوع کر لیا اور دیکھنے لگے۔ جہاز کے چلنے کی آواز اور گونج ہمیں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی، جسے ہم اب تک ذرا نظر انداز کیے ہوئے تھے۔ خیال تھا کچھ دیر بعد معاملہ سیٹ ہو جائے گا۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ نو بجے رات کا کھانا فرانسیسی حسینہ لے کر آگے پیچھے پھرنے لگی۔ تو کھانے کا معقول وقت تھا اب اس سے زیادہ کیا دیر کرنی، ہم نے ڈنر کھا لیا۔ اس کے بعد سوچا اب سامنے لگی ٹی وی سکرین سے کچھ فائدہ اٹھایا جائے۔ اور ایک پسندیدہ پروگرام کھول کر جیسے ہی ہیڈ فون کان میں لگائے، تو رتی بھر آواز بھی ہمارے کانوں میں نہ گئی۔ جہاز کی گونج سب آوازوں پر بھاری پڑ رہی تھی۔ ہیڈ فون اتار کر انھیں دوبارہ کانوں پہ سیٹ کیا کہ شائد پہلے سے کچھ بہتر نتیجہ مل جائے، لیکن کہاں جی، جتنا

یہ ایک بڑا جمبو جہاز تھا اسی لیے زور وشور سے منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ ہم سوچ میں پڑ گئے کہ اتنا لمبا سفر اور وہ بھی ٹی وی کے بغیر کیسے گزرے گا۔ اور ٹی وی پروگرامز کا شیڈول اشتیاق بڑھا رہا تھا۔ تنگ آ کر ہم نے ٹریولنگ کا ہی ایک چینل منتخب کر لیا۔ کہ آواز ہم تک پہنچے نہ پہنچے کم سے کم دیکھنے میں تو دلچسپ رہے گا۔ اور یہ طریقہ ہمارے کام آیا اور ہم ترکی ،امریکہ، ملائشیا، بمبئی ، ناروے ،ٹوکیو، ڈنمارک اور مختلف جگہوں کی سیر کرتے رہے۔۔ اور یہ ہمارے لیے بہتر رہا۔۔

سفر میں ہمیں نیند نہیں آتی ۔ اس لیے ہم دوسرے نیند میں جھولتے مسافروں کو اور ان کے زاویوں کو دیکھ کر مسکاتے رہتے ہیں ۔ اور نہ ہی کبھی جہاز کی تنگ سی ٹوائلٹ میں بار بار جاتے ہیں ۔صرف ایک بار ہی جاتے ہیں اور وہ بھی منزل کے قریب پہنچنے پر۔۔ تا کہ تھوڑا فریش اپ ہو سکیں ۔ اس لیے مسافروں کا ٹوائلٹ کی طرف بار بار آنا جانا اور وہاں انتظار کے لیے لائن بنانا ہمیں حیران کرتا رہتا ہے۔ کچھ لوگ اٹھ کر سیر کرنی شروع کر دیتے ہیں ۔ اور کچھ مسافر بچوں کو سیر کروانے لگتے ہیں ۔ اور ایک دو بار ہم نے مسافروں کو اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی گردن کو بار بار گھماتے ، کندھوں کو رول کرتے اور ٹانگوں کو آگے پیچھے ،اوپر نیچے کرتے دیکھا۔ اور ہم سوچنے لگے کہ جب ائر ہوسٹس بی بی جہاز میں حفاظتی اقدامات بارے بتاتی ہے،اس وقت تھوڑے ایکسر سائز کے سٹیپ بھی دکھا دیا کرے تو سب کا بھلا ہو۔۔

البتہ سفر میں اگر نیند تنگ کرے تو ہم تھوڑے نیند کے جھونکے ضرور لے لیتے ہیں ۔ اس کے بعد ہم پھر باقیوں کا حال زار دیکھنے کے لیے تازہ دم ہو جاتے ہیں ۔۔

کبھی کبھی لگتا ہے کہ منزل پیچھے سے آواز دیتی ہے۔ جیسے ٹورنٹو جاتے وقت فلائٹ میں جب بھی ذرا سکون سے آنکھیں بند کرتے تو ہمیں جرمنی کی یاد آتی ۔ کہ اب وہاں کیا بجا ہو گا۔ کیسے جھٹ پٹ پروگرام

بن گیا، جس کے نتیجے میں اب ہم حالت سفر میں ہیں۔اور پاکستان کی بجائے ہم اور ہی اطراف کی جانب سفر کر رہے ہیں۔اور پاکستان کی جانب جب بھی سفر کیا ہمیں یہی لگا ہم اپنے مدار کی جانب کھنچے چلے جا رہے ہیں۔اور کینیڈا کی طرف چونکہ کم سفر کیا ہے اس لیے اور طرح کے محسوسات محسوس ہوتے ہیں۔حالانکہ رشتے داروں کے علاوہ ملٹی نیشنل لوگوں کے درمیاں جا کر رہنا دل کو بہت خوشگوار احساس دیتا ہے۔پر یہی لگتا ہے کہ یقیناً وہ وطن کی خوشبو ہے جو ہمیں اپنی اور کھینچتی ہے۔۔

اور اب واپسی کے سفر میں ہم آرام سے آنکھیں بند کیے جہاز کی سیٹ سے ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ اور آنکھوں کے سامنے کینیڈا کے نظارے تھے۔پورے ٹرپ کا حال تخیلاتی تصویر بن کر گزر رہا تھا۔زندگی کے کتنے خوبصورت لمحات وہاں گزار کر آ رہے تھے۔کبھی کچھ سوچ کر مسکرا دیتے اور کبھی دل ان مہربانوں کو یاد کر کے اداس ہو جاتا۔ویسے یہ اندازہ تھا کہ ابھی یہ سلسلہ کچھ روز چلنے والا ہے اور جب ہم پھر سے پوری طرح جرمنی کی لائف روٹین میں مگن ہو جائیں گے تو یہ اک یاد سہانی کی طرح ہو جائے گا۔۔

جاتے ہوئے ہمارا سفر ایمسٹرڈم سے ٹورنٹو تک آٹھ گھنٹے میں طے ہوا تھا۔اور واپسی پر اسی فلائیٹ نے یہی سفر سات گھنٹے میں طے کرنا تھا۔ایک گھنٹہ کم وقت کی بچت ہمیں اچنبھے میں ڈال رہی تھی کہ یہ کیسے ممکن ہے۔تو ایک کرم فرما نے یہ اندازہ لگایا،

:جرمنی اور کینیڈا کے ٹائم ڈفرنس کی وجہ سے ایسا ہوگا۔:

ایک اور کرم فرما کا کہنا تھا،

:نہیں،ہوا ساتھ دے گی۔ہوا کا رخ اس سمت کا ہوگا۔:

اور اصل کیا حقیقت تھی،اس بارے معلوم نہیں ہو سکا۔۔کہ کیوں؟

جہاز پہلے ہی آدھا گھنٹہ دیر سے روانہ ہوا تھا۔ اس لیے اس کے کچھ لیٹ وہاں پہنچنے کے امکان تھے۔ لیکن ہماری حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ جب جہاز نے ساڑھے چھ گھنٹوں میں شی پول ائر پورٹ پر پہنچا دیا۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ دوران پرواز پائلٹ نے دو تین بار بیلٹ باندھنے کا آرڈر دیا اور ہمارے ساتھ دل لگی کی۔ اس طرح ہوائیں ہمیں ایمسٹرڈم تک چھوڑ کر گئیں۔۔

ائر پورٹ بک شاپ

ٹورنٹو سے شام سات بجے جہاز نے ہمیں اپنے پروں میں بٹھا کر پرواز کے لیے اڑان بھری تھی۔ اور جب ہالینڈ پہنچے تو وہاں صبح کے سات بج رہے تھے۔ رات مختصر ہو چکی تھی کیونکہ ٹورنٹو کے وقت بمطابق ابھی رات کا ایک بجا تھا۔ کم از کم ہماری کلائی کو لگی گھڑی تو یہی بتا رہی تھی۔ اور ہم اسے بار بار دیکھ رہے تھے اور اگلی فلائیٹ تین گھنٹے بعد تھی لیکن جہاز کے آدھ گھنٹہ پہلے پہنچا دینے پر اب وقت ساڑھے تین گھنٹے میں بدل چکا تھا اور یہ انتظار کا وقت ہمیں شی پول ائر پورٹ پر گزارنا تھا۔ اب چاہے ہم اسے خوش ہو کر گزارتے یا نیند کو بھگانے کے لیے ٹہل ٹہل کر گزارتے۔ بھئی ہمارے حساب سے تو ابھی رات ڈھلی تھی اور اب آنکھیں نیند کی کیفیت محسوس کرنے لگی تھیں۔۔ پہلے دل نے چاہا کہ مزے سے گھوم پھر کر شی پول ائر پورٹ دیکھیں گے۔ اس پر کافی کچھ نیا بنا بھی نظر آ رہا تھا۔ لیکن اگر ہم اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہناتے تو ایک فوٹو شوٹ اور ہونا تھا۔ جس کے لیے اب شائد وہ موڈ بنانا مشکل تھا۔۔

سو فوٹو شوٹ کینسل کر دیا۔ اور پاسپورٹ کے مرحلے سے گزر کر اپنے مطلوبہ لاؤنج میں داخل ہوئے۔ اور اندر جانے لگے۔ بس پھر جاتے جاتے راستے میں جو بھی قابل دید مقام اور جگہ آئی، اسے رک کر ضرور دیکھا۔ تبھی ایک بڑی سی بک شاپ نظر آئی۔ جو ادبی رسیا لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ پڑھنے والے لوگوں کو ہم جہاں بھی دیکھیں اک نادیدہ سی محبت جاگ اٹھتی ہے۔ انگلش، ڈچ کتابیں، ناول، میگزین کافی تعداد میں نظر آ رہے تھے۔ اور ہلکے پھلکے سنیکس بھی وہیں سے لیے جا سکتے تھے۔ ہمیں ایک موٹا سا فل سائز کا میگزین نظر آیا۔ جو کینیڈا کے کچن سے متعلق تھا۔ مختلف اقسام کی بریڈ، نان، رول اور بیکری کی اشیاء کی تراکیب پر مشتمل تھا۔ اور انگلش میں تھا۔ ہم فوراً آگے بڑھے اور اس میگ کی طرف بڑھتے

تین چار ہاتھوں سے پہلے ہی ہمارا ہاتھ تیزی سے اسے ریک سے اچک چکا تھا۔ بھئی ابھی ابھی تو کینیڈا سے آرہے تھے تو اس میگزین کو کیسے نظر انداز کردیتے، جو اتنا دیدہ زیب اور کارآمد لگ رہا تھا۔ تھوڑا سا کھول کر دیکھا تو اندر مزے مزے کے نان، بریڈز، رول اور جانے کتنا کچھ نظر آرہا تھا۔ اور انگلش میں تھا۔ اس کی قیمت دیکھی تو یورو کی بجائے ڈالر میں تھی۔۔

اگلی فلائیٹ تک کا وقت خلاف توقع بہت مشکل سے گزرا۔ کیونکہ نیند کے جھونکے تھے کہ چلے آ رہے تھے۔ اور یہاں اچھا خاصا دن چڑھ چکا تھا۔ تو ایسے میں ہم نیند سے جھولتے کیا اچھے لگتے۔۔ آخرکار یہ مشکل گھڑیاں بھی بیت ہی گئیں اور جرمنی کی فلائیٹ کے لیے اناؤنسمنٹ ہو ہی گئی۔ اس سے پہلے گیٹ نمبر بھی تبدیل ہوا۔ پہلے یہ بات بہت کم ہی ہوا کرتی تھی کہ بورڈنگ کارڈ پر لکھا ہوا گیٹ نمبر تبدیل کردیا جائے۔ لیکن اس ٹور میں دوبارا ایسا ہوا۔ خیر یہ گیٹ آمنے سامنے ہی تھے اس لیے ہمیں اتنا فرق نہیں پڑا۔ جس نشست پر بیٹھے تھے، وہاں سے اٹھ کر سامنے والی نشستوں پر جا بیٹھے۔ بلکہ اچھا ہی ہوا کہ اس مختصر اٹھنے بیٹھنے سے تھوڑا نیند کی کیفیت سے سنبھل گئے۔ اور آدھا گھنٹہ پہلے اتنی دیر سے انتظار کرتے مسافروں کے لیے بلاوا آ ہی گیا۔ اور یہ منظر ہمیشہ ہمارے لیے بڑا دلچسپ رہتا ہے۔ جب مسافر اٹھ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ (جیسے شادی کا کھانا شروع کرنے کا بلاوا مل گیا ہو۔) اور لائن میں جا لگتے ہیں اس اتاولے پن پر ہم لوگوں کی پھرتیاں دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ بھئی، جہاز کسی کو چھوڑ کے تھوڑی جائے گا۔ اور نہ کوئی جلدی جا کر دوسرے کی سیٹ پر قابض ہو جائے گا۔ بلکہ ہمیں تو بڑا مزا آتا ہے کیونکہ ہمارے پاس بڑا ہی کارگر گر ہوتا ہے۔ ہم گھر بیٹھے ہی کھڑکی والی سیٹ بک کر لیتے ہیں۔ اور جہازی عملے کی طرف سے تشریف لے جانے کی دعوت ملتے ہی آرام سے ٹہلتے ٹہلتے لوگوں کی بے چینی

اور پھرتیاں دیکھتے دیکھتے جہاز کے اندر پہنچتے ہیں۔اگر سفر میں ہم سفر ساتھ ہوں تو سچویشن اور ہوتی ہے۔اوراگر ہم اکیلے ہی دنیا کی سیر کو نکلے ہوں تو تب بالکل اور۔۔اور یہ گر بھی تبھی کے لیے ہے کہ ہمیں تو بس جہازی کھڑکی سے لگاؤ ہے۔اب چاہے وہ جہاز کے آخری حصے میں ہو،ہمیں پرواہ نہیں۔بس ہمیں تو اپنی کھڑکی والی سیٹ پر ہی بیٹھنا ہے۔تو ہوتا کچھ یوں ہے کہ اس آرام آرام سے جانے اوراپنی سیٹ تک پہنچنے کے چکر میں لوگوں کے رویوں کو دیکھنے کا موقع مل جاتا ہے۔جو پہلے اندر پہنچ چکے ہوتے ہیں، پھر بھی اک ہڑبونگ سی مچی ہوتی ہے۔بچے علیحدہ شور مچا رہے ہوتے ہیں۔صاحب سامان اوور ہیڈ کمپارٹمنٹ میں جمانے میں لگے ہوتے ہیں۔بیگم بھی بچوں کو اٹھا اٹھا کر سیٹوں پر جلد بٹھانے کے لیے چیخ رہی ہوتی ہے۔اور ساتھ ساتھ میاں کو آرڈر بھی،

:سنیے،ذرا یہ جیکٹ بھی اوپر رکھ دیجئے گا۔اور وہ کمبل نیچے لے آیئے گا۔اور ذرا جلدی کیجئے گا۔یہ آفت میرے قابو میں نہیں آنے والی:

اور میاں باقی لوگوں کا راستہ روک کر کھڑے ہیں۔اور باقی لوگ کھڑے یہ مفت کا ڈرامہ دیکھ رہے ہیں۔ کچھ سے رہا نہیں جاتا اور وہ ان صاحب سے پلیز،پلیز کرنے لگتے ہیں۔اوراپنی اپنی سیٹوں کی جانب بھاگے جا رہے ہیں۔ہمیں سمجھ نہیں آتی۔بھئی، جہاز کے اندر تو آ گئے ہو، اب کاہے کا ڈر اور جلدی۔کہ جلد سے جلد ایسے سیٹوں پر بیٹھنا چاہتے ہو۔جیسے آ گے فلم کا پردہ اٹھنے والا ہے یا روٹی کھلنے والی ہے۔ مہربان،روٹی بھی گرم گرم ائر ہوسٹس کھولے گی۔اور فلم بھی بڑے پردے کی بجائے سامنے چھوٹے پردے پر دیکھ لینا۔۔لیکن تھوڑا دھیرج سے کام تو لو۔۔

اور جہاز کی انھی گزرگاہ راہوں میں کہیں ہم بھی کھڑے یہ سب دیکھ کر مسکا رہے ہوتے ہیں۔سنا تھا تماشا

گھر گھر کا۔۔لیکن یہ جہاز والا تماشا بھی اب اکثر دیکھ چکے ہیں۔اور کبھی کبھی مسافروں کو آپس میں ایک دوسرے سے الجھتے بھی دیکھا ہے۔ جب ایک ہی سیٹ کے دو دعوے دار پیدا ہو جاتے ہیں۔اور بجائے جہاز والوں سے شکوہ کناں ہونے کے ایک دوسرے کو ہی موردالزام ٹھہرانے لگتے ہیں۔اور جن کی وجہ سے یہ غلط فہمی ہوئی وہ بھی آرام سے باقی مسافروں کی طرح یہ سین ملاحظہ فرما رہے ہوتے ہیں۔اور تب ہماری سوچ ارتقائی موڑ لینے لگتی ہے کہ کہیں یہ ایک دوسرے کا سامان اٹھا کر جہاز سے باہر نہ پھینک دیں۔ان کے لڑنے کا منظر اچھی طرح دیکھ چکنے کے بعد باقی مسافروں کو ہوش آتا ہے کہ ان کو صحیح۔۔دشا ۔۔دکھائیں کہ جہازی عملے سے رجوع کریں۔اور تب ائر ہوسٹس پلیز، پلیز کرتے معاملہ سلجھانے لگتی ہے۔اور شطرنج کے مہروں کی طرح مسافروں کو آگے پیچھے سیٹوں پر سیٹ کرتی ہے۔اور تبھی تماشا دیکھنے والوں میں سے بھی چند ایک کو اپنی سیٹ سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں اور انھیں بھی کسی نئی کھڑکی اور نئے ہم سفر کا ساتھ ملتا ہے۔۔

انھی نظاروں کو دیکھتے ان سے گزرتے ہم بھی اپنی سیٹ تک پہنچ ہی جاتے ہیں۔ہماری کھڑکی والی سیٹ کب سے ہماری منتظر ہوتی ہے۔اور اس کے ساتھ والی سیٹوں پر مسافر کب کے پہنچ کر براجمان ہو چکے ہوتے ہیں۔یقیناً کھڑکی والی سیٹ کو حسرت سے تکتے بھی ہوں گے۔اور دل میں خواہش بھی رکھتے ہوں گے کہ یہ سیٹ خالی ہی رہے۔تاکہ اس سے باہر نظر آنے والے سارے نظارے، بادل، آکاش، چاند، ستارے، دریا، سمندر، ہریالی سب ان کے ہو جائیں۔اور اسی وقت ہماری آمد ہو جاتی ہے اور انھیں ہمارے استقبال کے لیے کھڑے ہونا پڑتا ہے۔۔اور ہم اپنا آپ سنبھال کر نزاکت سے ان کے آگے سے گزر کر اپنی سیٹ پر جا بیٹھتے ہیں۔اور اگر ہمارا ہینڈ کیری کافی بھاری بھرکم ہو تو انھی میں سے

ایک کوا سے اوپر۔۔اوور ہیڈ کمپارٹمنٹ میں بھی رکھنا پڑتا ہے۔۔

اوراب کی بار ہم کچھ نیند سے ڈولتے اپنی جگہ پر پہنچ چکے تھے۔اور جب اپنی خود کی یہ حالت تھی تو پھر کہاں کے نظارے۔۔ویسے بھی ٹورنٹو سے ہالینڈ تک۔۔جمبو۔۔میں بیٹھ کر بڑی شان سے آئے تھے اوراب جرمنی جاتے ہوئے اسی ائر لائن کے ایک چھوٹے سے فوکر جہاز میں بیٹھے تھے۔لگ رہا تھا کہ تھکن کے ساتھ ساتھ ہماری شان بھی تھوڑی سی کم ہوگئی ہے۔اب واپس گھر جارہے ہیں تو ایسا بھی کیا۔۔اوراس فوکر نے شور کرنے میں جمبو کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔بلندی پر لے جا کر ہمارے کانوں کے پردے پھاڑ دینے کا پروگرام بنایا تھا۔صاف لگ رہا تھا کہ ہمیں بے دلی سے جرمنی لے جارہا ہے۔وہ تو شکر ہے کہ اب جہاز میں دنیا کا چکر لگاتے لگاتے ہمیں کافی آگاہی ہوچکی تھی۔اس لیے بیگ میں ہاتھ ڈال کر ایک کونے سے چیونگم برآمد کر لی اور لگے بے نیازی سے چبانے۔۔

ایک گھنٹے کا سفر تھا اوراتنے مختصر سفر میں جہازی میزبان بھی اوپر اوپر سے مہمانی کرتے نظر آتے ہیں۔سو،کھانے کو تو پوچھا ہی نہیں حالانکہ جرمن کا متھ ٹاک شروع ہورہا تھا۔اور ایک ایک سنیک دے کر وہ لیے گھومتے پھرتے تھے۔اور چائے کی جگہ بھی بس ایک چھوٹا سا گلاس جوس دے ڈالا۔ہماری تو خیر تھی پر چائے کے رسیاؤں کا ہی کچھ خیال کیا ہوتا۔دلی میزبانی تو یہ انٹرنیشنل فلائیٹ میں کرتے ہیں۔۔اسی لیے واپسی کی فلائٹ پر نہ تو کسی نے پزا آفر کیا اور نہ ہی آئس کریم کی ٹھنڈی مار ماری۔ویسے بھی جب جانے اورآنے کی ڈبل ٹکٹ خریدی ہو تو جہاز والے مسافر کو جاتے ہوئے پھولوں کی طرح اس کی راہ میں بچھتے ہوئے یس سر،یس مام کرتے ہوئے لے جاتے ہیں۔اور واپسی پر ان کا یہی رویہ بے اعتنائی کا شکار ہو چکا ہوتا ہے۔۔شائد ان پر بھی مروت اور بے مروتی کے موسم آتے رہتے ہیں۔۔

جہاز کب کا جرمنی کی فضاؤں میں داخل ہو چکا تھا۔اور شور شرابے جیسی آوازوں کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا کہ پائلٹ کی آواز ابھری۔اس نے جلد اترنے کی نوید سنائی۔اور پھر جہاز آہستہ آہستہ نیچے آنے لگا۔اور تقریباً دس منٹ کے بعد ہم جرمنی کے ایک شہر کے ائرپورٹ پر اتر چکے تھے اور جہاز سے باہر آ چکے تھے۔ اور پھر سے انھی ہواؤں میں سانس لینے لگے تھے،جن میں کبھی ہٹلر بھی سانس لیتا ہوگا۔۔

اور پیچھے کینیڈا کہیں دور بہت دور رہ گیا تھا۔۔۔

آشیاں اپنا

اڑھائی پونے تین ماہ کے بعد گھر واپسی ہوئی تھی۔ گھر پر نظر ڈالتے ہی اس پر پیار اُمڈ آیا۔ ویسا ہی پیار جو پاکستان سے آ کر محسوس ہوتا ہے۔ اپنا گھر دنیا کے جس کونے میں بھی ہو دل میں بستا ہے۔ اور اس کی جانب قدرتی کشش بڑھتی ہے۔ ایک نظر میں تو گھر کچھ اجنبی سا نظر آیا۔ ہم اپنی آنکھیں مل کر رہ گئے۔ در و دیوار پر بھی اجنبیت سی چھائی ہوئی تھی۔ جب غور کیا تو یہ وہ اداسی تھی جو ہمارے بغیر اسے ہوئی۔ جبکہ ہم تو واپس آتے ہی اس پر صدقے واری ہو گئے تھے۔ اپنے تکیے کو بڑی خوشی سے دیکھا اور سامنے کتابوں والے ریکس میں پڑی کتابوں کو بھی بڑی محبت سے چھو کر دیکھا۔ دو چار میگزین کینیڈا سے لے آئے تھے وہ اس میں ترتیب سے رکھے۔ تحائف دیکھ کر اک بار پھر مہربانوں کی محبت یاد آ گئی۔۔

دوست احباب ہمیں ایسے مل رہے تھے، جیسے ہم حج سے واپس آئے ہوں۔ اور ابھی نکال کر انھیں کھجوریں، تسبیح اور جائے نماز دے دیں گے۔۔ ہماری غیر موجودگی کے تین ماہ انھیں تین سال کے برابر لگ رہے تھے۔ کینیڈا کی باتیں اور ہماری زبانی وہاں کے قصے سننے کو بے تاب ہو رہے تھے۔ اور تابڑ توڑ سوالات کر رہے تھے۔

جانے اور آنے کا سفر کیسا رہا۔؟

کینیڈا میں ڈٹ کے سردی پڑی ہو گی نا۔۔ دیکھا ہم پہلے ہی کہتے تھے۔ ویسے کتنی سردی پڑی۔؟

کے ایل ایم کی فلائیٹ کیسی رہی؟ کھانے پینے کو اچھا دیا کہ بس۔۔؟

نیاگرا فال تو ضرور دیکھی ہو گی نا؟

سی این ٹاور دیکھا؟

بلفر پارک دیکھا؟

مانٹریال گئے؟

اوروہ وہاں پاکستانی انڈین بازار گئے۔؟

مہنگائی کتنی تھی۔؟

یورو کے مقابلے ڈالرریٹ تو اچھا ملا ہوگا نا۔؟

دعوتیں تو خوب کھائی ہوں گی اور ہوٹلنگ بھی کی؟

ڈھیر سارے فوٹو کھینچے کہ نہیں؟

لگتا ہے جیسے گئے ہو ویسے ہی آ گئے ہو۔لگتا ہے کھایا پیا وہیں برابر ہو گیا۔۔

آہا۔۔اور یہی بات ہم ان کے منہ سے سننا چاہتے تھےاور ہمارے دل میں پھلجڑی چھوٹ چکی تھی۔ہم بھی ان کے پے درپے سوالات کے ترتیب وار جوابات دیتے گئے۔اور اپنے ٹور کا بتاتے گئے۔اور فوٹو دکھاتے گئے۔۔

گھر واپس آکر دوبارہ اپنی روٹین میں آنے کے لیے چند دن ہی لگے۔

جب جرمنی واپس آئے تو یہاں کا موسم بڑا معتدل تھا۔احباب بتاتے رہے کہ یہاں اس سال اتنی سردی نہیں پڑی اور برفباری بھی بہت معمولی سی ہوئی ہے۔اس لیے سردی کا موسم بہت اچھا گزرا ہے۔

کینیڈا کے احباب سے بھی رابطہ تھا۔وہ کہہ رہے تھے،

:آپ کے جانے کے بعد تو گھر خالی لگ رہا تھا۔:

:ہاں لگنا بھی چاہیے۔:

: ہم بہت دن اداس رہے۔:

: اور ہماری اداسی کی تو انتہا ہی نہ تھی۔:

"وہ آپ کی ایک ادبی دوست ملی تھی۔ سلام کہہ رہی تھی۔:

: والسلام، ہمارا بھی سلام کہنا۔:

"ہم فروری میں شائد پھر نیاگرا فال جائیں۔:

": ضرور جاؤ، وہ ساحرہ تو بار بار آنے کا بلاوا دیتی ہے۔:

: میں کل لائبریری آپکی لائی کچھ کتابیں واپس کرنے گئی تھی۔ ان میں ایک ناول میں نے پڑھنے کے لیے رکھا ہے۔ فرحت اشتیاق کا سفر کی شام۔۔ کیسا ناول ہے؟:

: بہت اچھا ہے۔ چار ناولٹ ہیں کتاب میں۔ اور بہت شکریہ آپکی محبتوں اور لائبریری کارڈ سے استفادے کے لیے:

؛او۔۔نو، ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم تو بہت خوش ہیں کہ لائبریری کارڈ آپ کے کام آیا۔:

: جرمنی میں موسم کیسا ہے؟:

: بہت اچھا:

: ہم پہلے ہی سوچ رہے تھے کہ آپ کینیڈا کی سردی سے بچ کر چلے گئے ہو۔:

: بس قدرت نے بچالیا۔ ورنہ ہمارا کیا تھا۔ ہم نے تو جہاز والوں کو موٹے گرم کپڑوں کا ایکسٹرا پیک تھما دیا تھا۔ لیکن مجال ہے ان میں سے بھی ایک بھی نکال کر پہنا ہو۔:

اس پر میزبان ہنسنے لگی۔

:اوہو، یہ تو واقعی اچھا نہیں ہوا۔:

:ہاں، تو اور کیا۔ ہم تو پہلے ہی سوچ رہے ہیں کہ یہ فالتو میں سامان لانا لے جانا اچھا نہیں ہوا۔ خوامخواہ جہاز والوں کو زحمت دی۔:

میزبان نے پھر قہقہہ لگا۔ اور کہا

اچھا اب آئندہ کا کیا پروگرام ہے۔؟

کس بارے میں۔۔؟

یہی دوبارہ کب کینیڈا آئیں گے۔؟

:لو کر لو بات۔۔ لگتا ہے ہمارے طفیل آپکو بھی دعوتیں اور ہوٹلنگ بھا گئی ہے۔؟

:سچی دل کی بات بوجھ لی، جب آپ یہاں تھے تو کبھی پکانے کی اتنی فکر نہیں ہوئی تھی۔ کبھی دعوت کبھی ریسٹورنٹ، کبھی چائینیز، کبھی دیسی، کبھی باہر سے کھانا آ رہا ہے۔۔ کبھی کوئی نئی ڈش۔۔

:اور اکثر بے چارا چکن۔۔۔:

میزبان پھر کھل کر ہنسی۔

:ویسے اس روزنامچے سے فرصت رہی کہ آج کیا پکائیں؟

:ہاں یہ فائدہ ہم دونوں کو برابر کا ہوا۔:

:چلیں بتائیں نا اب دوبارہ کب اور کس موسم میں یہاں آنا چاہیں گے۔؟

:بھئی یہ تو ابھی نہیں بتا سکتے کہ کب اور ابھی تو کچھ کہنا مشکل ہے کہ اب انگلینڈ کا دانہ پانی ہمیں اپنی اور کھینچے گا یا پاکستان کا۔۔ یا پھر کینیڈا کا۔ اور موسم کا کیا بتائیں۔ کینیڈا کی تھوڑی سردی، گرمی، تھوڑی خزاں

سب دیکھ لی۔اب بہار کا موسم ہو تو چاروں موسموں سے بخوبی آشنائی ہو جائے گی۔ابھی یہ تو کافی دور کی بات ہے۔اب تو آپ لوگ پہلے جرمنی آیئے گا،ہمیں انتظار رہے گا۔:

:جی ضرور انشاء اللہ،۔۔ایک دو سال میں چکر لگانے کا پروگرام تو ہے۔:

:گڈ،یہ تو بہت اچھا رہے گا۔اگر اپریل سے اکتوبر کا درمیانی وقت ہو تو اس بار آ پکو۔۔ہائیڈ پارک۔۔لے کر جائیں گے۔اور جرمنی کی ایک جھیل کی بھی سیر کروائیں گے۔۔،

:نائس،پھر تو بہت مزا آئے گا۔:

:جی بالکل۔۔بھئی،ہم جرمنی والے ہٹلر،ایلوس پر سلے کے علاوہ جھیل بھی رکھتے ہیں۔:

:ہاہاہا۔۔یہ آپ نے خوب کہی:

:نوازش،کرم،شکریہ،مہربانی،:

:آپ بھی تیار رہیے گا،مل کر چلیں گے اس بار فرانس جانے کا پروگرام بھی ہے۔پیرس دیکھنا چاہتے ہیں۔:

:ضرور دیکھو جناب ضرور،ہم تو کہتے ہیں پورا یورپ دیکھو۔ہالینڈ بھی چلیں گے۔ہم سے صرف دو گھنٹے کی مسافت پر ہے۔:

:ارے واقعی؟

:تو اور کیا،ہمیں ایمسٹرڈم جاتے اتنی دیر نہیں لگتی،جتنی فرینکفرٹ جاتے ہوئے لگتی ہے۔:

:ہوں اچھا۔۔جیسے ٹورنٹو اور نیا گرا فال آپ کو کینیڈا کے بڑے حوالے لگتے ہیں،جب ہم جرمنی کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہمیں ہٹلر،برلن،فرینکفرت اور میونخ یاد آ جاتے ہیں۔:

:آنے بھی چاہییں،یہ کوئی بھولنے والے تھوڑی ہیں۔:

:ویسے اس بار ہم بھی اپنے ٹور میں کینیڈا کی تاریخ بارے جان کر آئے ہیں۔؟

:رئیلی،وہ کیسے؟

:بھئی ٹورنٹو کی لائبریری میں بیٹھ کر کتاب۔۔او کینیڈا۔۔پڑھی تھی۔:

:یہ تو آپ نے خوب کیا،ہمیں یہاں رہ کر بھی کینیڈا کی تاریخ کا نہیں پتہ۔؟

:چلیں کوئی بات نہیں۔ ہر بات ہر بندے کے لیے نہیں ہوتی۔اور ویسے بھی اب تو یہ گمان ہونے لگا ہے کہ شائد ہم جرمنی کے بارے میں بھی اتنا نہیں جاتے،جتنا اب کینیڈا کے بارے میں جان گئے ہیں۔:

:ہاہاہا۔نہیں ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپکو جرمنی بارے پتہ نہ ہو۔ہمیں تو بس اتنا معلوم ہے کہ سکول میں بچوں کو۔۔او کینیڈا۔۔نظم سکھائی جاتی ہے۔اور ہر گھر میں بچے او کینیڈا،او کینیڈا اگا رہے ہوتے ہیں۔:

:چلو اچھا ہے۔او کینیڈا کے ذریعے سب ایک پلیٹ فورم پر تو رہیں گے نا۔:

:یہ بات تو ہے۔۔:

بس اس کے بعد ہم تھے،گھر تھا اور مصروفیت کا سامنا تھا۔دل چاہ رہا تھا کہ کچھ دن آرام کرتے ہوئے گزاریں۔اور پھر روزمرہ کی روٹین میں واپس آئیں۔۔لیکن ایسا کسی صورت ممکن ہی نہ تھا کہ ہمارا سفری سامان بکھرا پڑا رہے اور ہم شان سے بیڈ میں لیٹے کسی کتاب کا مطالعہ کرتے رہیں۔۔

☆☆☆☆☆

اگلے سفر کا انتظار

اب آہستہ آہستہ پیکنگ کھولنی شروع کی اور اپنے بھاری بھرکم موٹے، گرم کپڑوں کو دیکھتے ہی ہم مسکرا اٹھتے کہ یہ خواہ مخواہ ہی کینیڈا کی سیر کرآئے۔ حالانکہ ہم نے بڑے حساب سے اور سنی سنائی باتوں کے حساب سے ان کی پیکنگ کی تھی۔ اور اب سوچ رہے تھے کہ آئندہ صرف اپنے دل کی ہی سنیں گے۔۔ کہ تبھی ایسے میں اچانک۔۔

ایک ہفتہ ہی گزرا ہوگا کہ ایک دن اچھے بھلے معتدل موسم میں بہت سردی محسوس ہوئی۔ اور ہم نے لپک کر دروازے بند کرلیے۔ اور اسی پیکنگ میں سے ایک موٹی سی جرسی نکال کر پہن لی۔ گلے میں اونی شال ڈال لی۔ ہیٹنگ بھی تیز کرلی۔ ایک مگ کافی بھی پی لی۔ ہم نے سوچا کہ یہ فروری کی سردی ہے یہ تو بس جاتے جاتے اپنا زور دکھا کے جارہی ہے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں تھا۔ بلکہ سردی تو روز بروز اتنی زیادہ شدت سے بڑھی کہ دن کے وقت درجہ حرارت منفی تک پہنچ گیا اور ہم گھر میں گرم کپڑوں میں ملبوس، فل ہیٹنگ میں بیٹھے بھی کانپ رہے تھے۔ جس متوقع سردی کی تلاش میں ہم نے کینیڈا گھوم لیا۔ وہ اب جرمنی میں آ کر گلے مل رہی تھی۔ اور ٹی وی کی خبروں سے پتہ چل رہا تھا کہ روس کی طرف سے آئی اس سردی کی لہر نے یورپ کا رخ کرلیا تھا۔ اور اب پاکستان، کینیڈا کے احباب فون کرکے ہمارا حال احوال پوچھ رہے تھے۔ اور ٹورنٹو میں جس طرح مہربانوں نے میری کم چائے پینے کی عادت کو سن ان سنی کرکے ٹم ہارٹن کی کافی فرنچ ونیلا پلوائی تھی، اس کی حقیقتاً ضرورت اب جرمنی میں محسوس ہورہی تھی۔۔

دو تین ہفتے اس سردی نے خوب جلوے دکھائے اور ایک دن بہار کی نوید دے کر رخصت ہوئی۔۔۔
سو اب اس سردی کی شدت کو ہم اپنے حافظے میں محفوظ کرچکے ہیں۔۔

سو ابھی تو راوی چین ہی چین لکھ رہا ہے۔۔

کینیڈا کا ٹور اک خوبصورت یاد بن کر تخیل کی دنیا میں جا بسا ہے۔۔

اور اب اگلے سفری پروگرام تک ہم آرام سے اپنے گھر میں بیٹھے گنگناتے رہیں گے،

میرا گھر میری جنت وہ میرا آشیاں

میرا گھر میری جنت۔۔۔

اور۔۔

جس دن ہمیں اگلے سفری ٹور کے ٹکٹ ملیں گے تو ہم جلدی سے اٹھ کر سوٹ کیس پیک کریں گے اور آنکھوں میں نئے خواب سجا کر ان دیکھے انجانے مسافروں سے جا ملیں گے، جو کسی نہ کسی پڑاؤ پر ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔۔۔

اختتام

☆☆☆☆☆